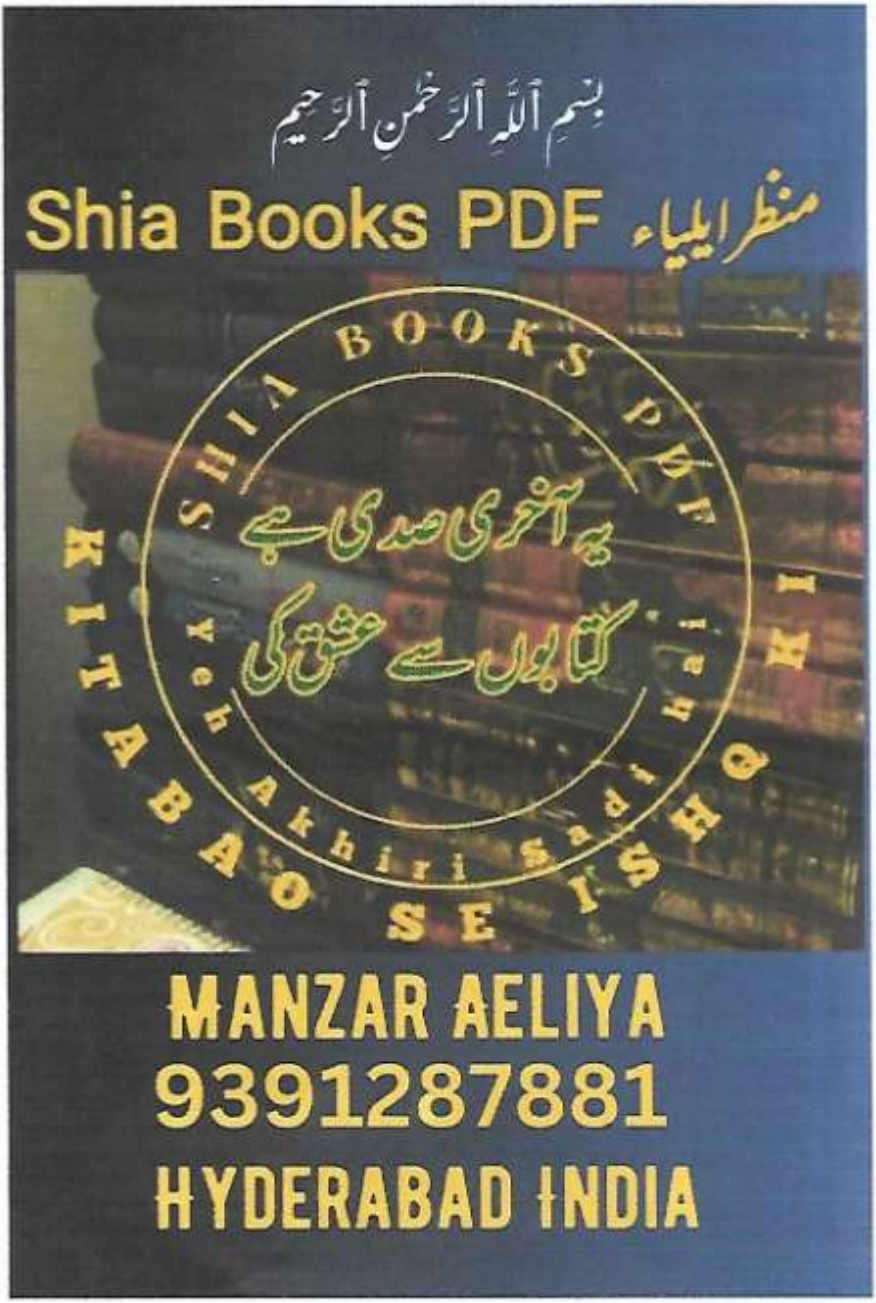

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم
Shia Books PDF منظر ایلیاء
SHIA BOOKS PDF
یہ آخری صدی ہے
کتابوں سے عشق کی
Yeh Akhiri Sadi Hai
KITABAO SE ISHQ KI
MANZAR AELIYA
9391287881
HYDERABAD INDIA

باسمہ سبحانہ

تعلیم

علوم قرآن

مصنف

آیۃ اللہ محمد ہادی معرفت

مترجم

مولانا سید ہادی حسن رضوی

ناشر

تنظیم المکاتب

گولہ گنج، لکھنؤ۔۱۸

فون:0522-2615115 فیکس:0522-2628923

ای میل:makatib@makatib.net

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	تعلیم علوم قرآن
مصنف	:	آیۃ اللہ محمد ہادی معرفت
مترجم	:	سید ہادی حسن رضوی
کمپوزنگ	:	منہال حیدر، شمشاد حسین
طباعت		
پہلا ایڈیشن	:	جولائی ۲۰۰۶ء
دوسرا ایڈیشن	:	فروری ۲۰۱۶ء
تعداد	:	پانچ سو
مطبوعہ	:	اے۔بی۔سی۔آفسیٹ پریس، دہلی
ناشر	:	تنظیم المکاتب، لکھنؤ۔انڈیا
ہدیہ	:	Rs. 90/-

فہرست

اسباق	عناوین	صفحات
عرض تنظیم		۷
مقدمہ		۹
پہلا سبق	علوم قرآن سے واقفیت	۱۱
دوسرا سبق	وحی الٰہی	۱۵
تیسرا سبق	نزول قرآن	۲۳
چوتھا سبق	اسباب نزول	۳۱
پانچواں سبق	کاتبین وحی	۳۸
چھٹا سبق	مکی اور مدنی سورے	۴۴
ساتواں سبق	قرآن مجید کے نام اور صفات	۵۶
آٹھواں سبق	جمع قرآن	۶۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نواں سبق	اختلاف مصاحف	۷۵
دسواں سبق	اتحاد مصاحف	۸۰
گیارہواں سبق	قرأت اور قارئین قرآن	۸۹
بارہواں سبق	قرأت حفص	۹۸
تیرہواں سبق	ناسخ و منسوخ	۱۰۸
چودھواں سبق	محکم و متشابہ	۱۱۸
پندرہواں سبق	حروف مقطعات	۱۲۸
سولہواں سبق	قرآنی قصے	۱۳۴
سترہواں سبق	قرآنی قسمیں	۱۴۷
اٹھارہواں سبق	قرآنی تمثیلات	۱۵۶
انیسواں سبق	قرآن کا اعجاز	۱۶۹
بیسواں سبق	اعجاز قرآن کے مختلف پہلو (۱)	۱۷۸
اکیسواں سبق	اعجاز قرآن کے مختلف پہلو (۲)	۱۸۵
بائیسواں سبق	شبہہ تحریف کا ازالہ	۱۹۶

عرض تنظیم

تحریک دینداری کے پہلے مرحلہ میں بانی تنظیم المکاتب خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ نے اگرچہ اپنی توجہ ''قیام مکاتب'' پر مرکوز رکھی تھی مگر آپ کا نصب العین اس قوم کی ہر فرد کو دیندار بنانا تھا۔ دینی تعلیم کے بغیر دینداری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اسی لیے آپ نے روز اول مکاتب کے ساتھ تعلیم بالغان اور مراسلاتی کورس کو بھی تنظیم المکاتب کے بنیادی اہداف میں شامل فرمایا اور آپ کی زندگی میں یہ شعبے کم وبیش فعال بھی ہو گئے تھے مگر خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی جس کا اہم سبب مناسب نصاب کا فقدان تھا۔

مکاتب کے ساتھ اسکول، جونیر ہائی اسکول اور ہائی اسکولوں میں دینی تعلیم کے فروغ کے ساتھ ہی قرآنیات، عقائد، احکام، تاریخ وسیرت اور اخلاق وحدیث پر مشتمل متوسط سطح کے ایسے نصاب کی ضرورت کا مزید احساس ہوا جس سے نوجوانوں میں دینی شعور پیدا ہو سکے۔ تربیت مدرسین کے علاوہ ادھر کچھ عرصہ سے نوجوانوں کے لیے دینی تعلیمی تربیتی کیمپ، مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ جیسے سلسلے شروع کیے گئے جن کے لیے بھی کتب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

نصاب کی تیاری ایک مشکل کام ہے اس کے لیے مختلف نمونوں، کتب اور مواد کے علاوہ صاحبان علم ہی نہیں بلکہ ماہرین فن کی ایسی تجربہ کار جماعت درکار ہوتی ہے جو یکسوئی کے ساتھ یہ کام انجام دے سکے اس راہ میں جن دشوار گذار اور صبر آزما مراحل سے گذرنا ہوتا ہے اس کا ادراک وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایسے مشاغل سے سروکار رکھتے ہیں۔

موجودہ صورتحال میں مناسب محسوس ہوا کہ از سر نو نصاب ترتیب دینے اور تجربہ کرنے کے

بجائے مختلف ممالک اور زبانوں میں نوجوانوں کی تربیت کے لیے رائج نصاب سے استفادہ کیا جائے۔

چنانچہ طلاب کی سطح کے اعتبار سے تلاش شروع کی گئی مگر کسی ایک مرکز سے کوئی ایک ایسا جامع نصاب نہ مل سکا جو ہمارے ملک کی نسل نو کے دینی ضروریات کو پورا کر سکے لہٰذا مختلف تعلیمی مراکز میں رائج نصاب سے انتخاب کیا گیا جس کے باعث اسلوب نگارش، انداز بیان اور سطح فکر میں اختلاف ناگزیر ہے۔

کتب کا اردو میں ترجمہ بھی ایک مرحلہ تھا۔ اس مرحلہ میں حوزۂ علمیہ قم میں زیر تعلیم اہل علم اور خوش استعداد صاحبان قلم خصوصاً جامعہ امامیہ تنظیم المکاتب کے افاضل سے مدد لی گئی۔ اس طرح الحمد للہ اب قرآنیات، عقائد، احکام، تاریخ وسیرت اور اخلاق وحدیث پر مشتمل نصاب مرتب ہو کر اشاعت کی منزل میں ہے۔ فی الحال ان موضوعات سے روشناس کرانا مقصود ہے۔ آئندہ تجربہ کی روشنی میں کتب یا ان کے مشمولات میں تبدیلی کا امکان ہے جس کے لیے ہم اہل نظر اور ارباب بصیرت کی مثبت آراء اور تنقید کے منتظر ہیں۔

زیر نظر کتاب ''تعلیم علوم قرآن'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں جن حضرات نے تعاون فرمایا ہم ان کے شکرگذار ہیں۔ مترجم کتاب جناب مولانا سید ہادی حسن رضوی صاحب فاضل جامعہ امامیہ، ہمارے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں جن کی کاوشوں سے زیر نظر کتاب کی اشاعت کا شرف ہمیں حاصل ہو رہا ہے۔

والسلام

سید صفی حیدر

سکریٹری

۱۵رجمادی الاول ۱۴۲۷ھ

مقدمہ

اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ آیۃ اللہ محمد ہادی معرفت کی علوم قرآن کے موضوع پر مندرجہ ذیل گراں بہا کتابوں کا خلاصہ ہے:

۱۔ التمهيد في علوم القرآن

۲۔ صيانة القرآن من التحريف

۳۔ علوم قرآنی

۴۔ تاریخ قرآن

اس کتاب میں علوم قرآن کے حتی الامکان سارے موضوعات پر بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علوم قرآن میں مبتدی افراد کی سہولت کے لئے کتاب کے مطالب میں سادگی اور سلاست کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں ہر سبق کے آخر میں دیئے گئے سوالات اس سبق کے سارے مطالب پر محیط ہیں۔ اگر کوئی طالب علم ان کے جوابات یاد کر لے تو گویا اس نے مختصر سہی مگر علوم قرآن کے ایک جامع دورہ (مرحلہ) کی تعلیم حاصل کر لی ہے۔

یہ کتاب حوزات علمیہ اور قرآنی مدارس و مراکز میں تدریس کی غرض سے مرتب کی گئی ہے اور اسی لئے ابتدائی مواد کی جمع آوری کے بعد حوزۂ علمیہ قم کے تعلیمی اور تحقیقی مرکز حوزۂ علمیہ برائے خواتین کے ڈائرکٹر اور بعض دوسرے ممتاز اور نامور اساتذہ اور علوم قرآن میں مہارت رکھنے والے حضرات سے مشورہ کرنے کے بعد آیۃ اللہ ہادی معرفت مدظلہ العالی کی نگرانی میں باضابطہ طور پر اس کتاب کی تدوین کی گئی ہے۔

قارئین محترم اور طلاب کرام کی توجہ کے لئے عرض ہے کہ اس کتاب میں موجودہ مطالب کی تفصیل کے لئے ''علوم قرآنی'' یا ''التمہید'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

محترم اساتذہ، طلاب اور قارئین سے گذارش ہے کہ کتاب کے سلسلہ میں اپنے بے لوث مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیں۔

مؤسسہ فرہنگی تمہید
قم۔ایران

پہلا سبق

علوم قرآن سے واقفیت

قرآن مجید وہ ایک اکیلی آسمانی کتاب ہے جو ابتدا سے اب تک اپنی اصلی حالت پر باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس مقدس کتاب کے سلسلہ میں بحث و گفتگو خدا کی معرفت کی ضروریات میں سے ایک ضرورت ہے تا کہ اصل کلام الٰہی سے واقفیت ہو سکے۔

آنے والے سبق میں کی گئی بحثوں کی ابتدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم ''علوم قرآن'' اور ''تفسیر قرآن'' جیسی اصطلاحوں سے واقف ہوں اور ان کے درمیان پائے جانے والے فرق سے آگاہ ہوں لہٰذا اس سبق میں آپ علوم قرآنی کے مفہوم اور اس موضوع پر لکھی جانے والی اہم کتابوں سے واقفیت حاصل کریں گے۔

درحقیقت علوم قرآنی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) وہ علوم جو خود قرآن سے متعلق ہیں۔

(۲) وہ علوم جو قرآنی کے مندرجات اور مضامین سے ماخوذ ہیں۔

دوسرے لفظوں میں ہم جب خود قرآن مجید کو ایک تحقیقی زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں مثلاً یہ کتاب کیسے نازل ہوئی؟ کس طرح اور کن مراحل سے گذر کر اس کی تدوین و ترتیب ہوئی؟ اور موجودہ صورت میں کیوں کر تشکیل پائی؟ اس کتاب کے دوسرے تحقیقی موضوعات یہ ہیں کہ آیتوں کے درمیان کس طرح کا ربط ہے اور کیسا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟ کیا کچھ آیتیں دوسری آیتوں کے لئے تفصیل و تشریح کا کردار ادا کرتی ہیں اور پھر ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید، عام و خاص اور محکم و متشابہ جیسے رابطے آیتوں کے درمیان برقرار ہیں یا نہیں؟ اعجاز قرآن کا مفہوم کیا ہے؟ نیز تاریخ تفسیر، مشہور و معروف مفسرین اور ان کے تفسیری اسلوب سے معرفت

بھی علوم قرآنی کے اہم موضوعات میں سے ہیں۔

مذکورہ مباحث کے لئے ''علم قرآن'' کے بجائے ''علوم قرآنی'' یعنی مفرد کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ علوم میں سے ہر ایک بذات خود اپنی ترتیب و تنظیم اور وسعت کی بنا پر ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتا ہے مثلاً علم اعجاز، علم تجوید، علم قرأت، علم تاریخ قرآن۔ البتہ علوم قرآنی تک رسائی کے لئے بحث و تحقیق ان سارے علوم کا نقطۂ اشتراک ہے۔

قرآنی علوم کا دوسرا حصہ اس کتاب الٰہی کے مضامین اور مندرجات کے افہام و تفہیم سے تعلق رکھتا ہے جسے تفسیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس کا اپنا مخصوص اسلوب اور انداز ہے۔ علوم قرآنی سے واقفیت تفسیر قرآن کی لوازمات میں سے ایک لازمہ ہے۔

مذکورہ وضاحتوں کی روشنی میں یہ بات آشکار ہوگئی کہ علوم قرآنی، تفسیر قرآن یعنی کلام الٰہی کے مندرجات اور مضامین کے مطالعہ پر مقدم ہیں، اسی وجہ سے پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد علوم و تفسیر قرآن کے میدان میں پیش رفت کرنے والی بزرگ ہستیاں بہت جلد ہی نمایاں ہوگئیں۔ اصحاب رسولؐ میں حضرت علیؑ اس میدان میں بھی سب سے آگے آگے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ جلال الدین سیوطی رقمطراز ہیں کہ ''خلفاء کے درمیان تفسیر قرآن کے بارے میں سب سے زیادہ مطالب بیان کرنے والے حضرت علیؑ ہیں'' حضرت علیؑ کے بعد عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن مسعود اور ابی بن کعب جیسے صحابہ اس سلسلہ کی نامی گرامی شخصیتیں ہیں۔

تفسیر اور مباحث قرآنی کی تدوین ۲۰۰ھ سے شروع ہوئی۔ قرآن مجید کے حوالہ سے بحث کرنے والے سب سے پہلے شخص یحییٰ بن یعمر ہیں جو ابوالاسود دؤلی (متوفی ۸۹ھ) کے شاگرد تھے۔ انھوں نے فن قرأت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جو اس زمانہ میں رائج مختلف انواع و اقسام کی قرأتوں پر مشتمل تھی۔ ان کے بعد حسن بصری (۱۱۰ھ) نے آیات قرآن کی تعداد کے بارے میں ایک کتاب لکھی اور پھر اس کے بعد علوم قرآن کے موضوع پر بہت سی کتابیں بطور مستقل یا تفسیروں

کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئیں جس کے نتیجہ میں علوم قرآنی کا موضوع قیمتی اور جامع کتابوں سے مالا مال ہوگیا جن میں سے ''البرھان'' اور ''الاتقان'' نام کی دو کتابیں خصوصی اور امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔

''البرھان فی علوم القرآن'' امام بدرالدین زرکشی کی تالیف ہے۔ آپ آٹھویں صدی ہجری کے سب سے نمایاں علماء اور دانشمندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ ۷۴۵ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے اور اسی سرزمین پر آپ کی نشوونما ہوئی۔ آپ مختلف اسلامی علوم میں استادی کے مرتبہ تک پہونچے۔ آپ کی شہرہ آفاق کتاب ''البرھان فی علوم القرآن'' کا شمار علوم قرآنی کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب جامع بھی ہے۔ اس مختصر کتاب میں علوم قرآنی سے متعلق ۴۷ عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت ضروری مواد بھی فراہم کردیئے گئے ہیں۔ دوسری کتاب جلال الدین عبدالرحمن سیوطی کی تالیف ''الاتقان فی علوم القرآن'' ہے یہ ۸۹۴ھ میں مصر کے ''السیوط'' نامی شہر میں پیدا ہوئے۔ اور ۹۴۴ھ میں قاہرہ میں وفات پائی۔ علم حدیث، تفسیر اور دوسرے اسلامی علوم میں ان کی تصنیف و تالیف اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے اپنی مایہ ناز کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں علوم قرآنی کے حوالے سے ۸۰ عنوانات پر بحث کی ہے۔ دور حاضر میں یہ کتاب علوم قرآن کے موضوع پر محققین کے لئے موجودہ منابع اور ماخذ کے لحاظ سے جامع ترین شمار ہوتی ہے۔

ماضی قریب میں بہت سے دانشوروں منجملہ علماء شیعہ نے علوم قرآن کے موضوع پر مفصل اور مبسوط کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ ان میں سے موجودہ زمانے کی منفرد شخصیت استاد سید ابوالقاسم خوئیؒ کی معرکۃ الآراء تالیف ''البیان'' کا تذکرہ اشارۃً کیا جارہا ہے۔ یہ کتاب علوم قرآن کے حوالہ سے بہترین اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بیش بہا خزانہ ہے، یہ کتاب دور حاضر میں علوم قرآنی کے اہم ترین منابع میں سے ایک منبع اور ماخذ کے طور پر یونیورسیٹز اور حوزات علمیہ کی توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

سوالات

۱۔علوم قرآنی کی تعریف کرتے ہوئے بتایئے کہ اس علم کے لئے واحد کے بجائے جمع کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا ہے؟

۲۔علوم قرآن کے موضوع پر بحث وتحقیق کی ضرورت کیا ہے؟

۳۔علوم قرآنی کے سلسلہ میں پانچ زیر بحث عنوانات کے نام بتائیں۔

۴۔علوم قرآنی کے موضوع پر دو اہم ترین کتب اور ان کے مؤلفین کے نام بتایئے۔

دوسرا سبق

وحی الٰہی

وحی کے بارے میں بحث اس وجہ سے اہمیت کی حامل ہے وحی کہ دراصل کلام خدا تک پہونچنے اور اس کی معرفت کی بنیاد ہے۔علوم قرآن کی سب سے اہم اور بنیادی بحث شاید وحی سے متعلق ہو۔وحی الٰہی کی معرفت ،ملاء اعلیٰ اور اس مادی دنیا کے درمیان رابطے کی کیفیت اور اس موضوع سے جڑے سوالوں کے جوابات سے آگاہی کے نتیجے میں قرآنی تعلیمات کو سمجھنے اور غور وفکر کرنے کی راہیں ہموار ہو جاتی ہیں۔

وحی کے لغوی معنی

لغوی اعتبار سے وحی کے کئی معنی ہیں مثلاً اشارہ، کنایہ، پیغام، چھپی باتیں، خفیہ اطلاع تیزیں اور جلدی۔ ہر وہ چیز جو کلام، تحریر، پیغام یا اشارے کے طور پر دوسروں سے چھپا کر کسی کو سمجھائی جائے اسے وحی کہا جاتا ہے۔

علم لغت کے ماہر راغب اصفہانی رقمطراز ہیں کہ "وحی وہ پیغام ہے جو بہت تیزی کے ساتھ اشاروں میں پہونچایا جائے۔" (المفردات فی غریب القرآن ص/۵۱۵)

ابو اسحاق کا نظریہ بھی یہی ہے کہ دراصل لغت میں وحی خفیہ پیغام کو کہتے ہیں اور اسی وجہ سے اہل لغت الہام کو وحی کہتے ہیں۔

وحی قرآن کی نظر میں

لفظ وحی قرآن میں چار معنوں میں استعمال ہوا ہے:۔

۱- خفیہ اشارہ : یہ وہی لغوی معنی ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ حضرت زکریاؑ کے بارے میں خاموشی کا روزہ رکھنے کی منظر کشی اس انداز سے ہوتی ہے:

"فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا" (مریم/۱۱)

"حضرت زکریاؑ محراب عبادت سے اپنی قوم کی طرف نکلے اور ان سے اشارہ کیا کہ صبح و شام اللہ کی عبادت کرتے رہو۔"

۲- فطری ہدایت : فطری ہدایت سے مراد وہ ہدایات، احساسات اور ادراکات ہیں جنہیں اللہ نے تمام مخلوقات کی ذات میں ودیعت کر دیا ہے۔ ہر مخلوق خواہ اس کا تعلق جمادات، نباتات یا حیوان و انسان سے ہو، فطری طور پر اپنی بقا اور تحفظ زندگی کی راہوں سے باخبر ہے۔ اس فطری ہدایت کو قرآن مجید میں وحی کے نام سے یاد کیا گیا ہے:۔

"وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا" (نحل/۶۸،۶۹)

"اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی کیا (فطری ہدایت) کہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں اپنے گھر بنائے اس کے بعد مختلف پھلوں سے غذا حاصل کرے اور نرمی کے ساتھ اپنے رب کے راستے پر چلے۔"

۳- الہام یا غیبی امداد : کبھی کبھی انسان ایسے پیغام دریافت کرتا ہے جس کے اصل مرکز سے بے خبر ہوتا ہے یعنی پیغام اس تک پہونچتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ کہاں سے اور کس کی جانب سے یہ پیغام اس تک پہونچ رہا ہے۔ خصوصاً سخت اضطراب و پریشانی کی حالت میں جب اسے کوئی راہ چارہ و تدبیر نظر نہیں آتی تو بعض اوقات اچانک اس کے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہوتی ہے جو اس کے لئے راہ تدبیر بن کر اسے مایوسی اور نا امیدی سے بچا لیتی ہے، انسان کی رہنمائی اور عقدہ کشائی کرنے والے پیغامات کو الہام کہا جاتا ہے جو پس پردہ اور غیب سے ظاہر ہو کر انسان کی

نصرت و امداد کرتے ہیں۔ یہ غیبی رہنمائی جو در حقیقت عنایت الٰہی ہے۔ قرآن میں وحی کے نام سے یاد کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں مادر موسیٰؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "اِذْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّكَ مَا یُوْحٰۤی، اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ" (طٰہٰ/۳۸،۳۹)

"(اے موسیٰ) جب ہم نے تمہاری ماں کی طرف ایک خاص وحی کی کہ اپنے بچہ کو صندوق میں رکھو اور صندوق کو دریا میں ڈال دو موجیں اسے ساحل تک پہونچا دیں گی اور اسے ایسا شخص اٹھا لے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور موسیٰ کا بھی دشمن ہے۔"

ان آیات کی رو سے حضرت موسیٰؑ کی ولادت کے بعد جب آپ کی مادر گرامی کو تشویش ہوئی تو اچانک آپ کے دل میں خیال آیا کہ اللہ پر بھروسہ کر کے بچے کو دودھ پلائیں اور خطرے کی صورت میں لکڑی کے صندوق میں رکھ کر دریا کے حوالہ کر دیں۔ اسی وقت آپ کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ یہ بچہ صحیح و سالم حالت میں دوبارہ ان تک پہونچے گا؟ لیکن پھر خیال آیا کہ مجھے ذرہ برابر بھی پریشان اور غمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مادر موسیٰ کے دل میں آنے والے یہ خیالات در حقیقت امید کی کرنیں تھیں۔

اسی طرح کے راستہ دکھانے والے اور خوف و ہراس سے نجات دینے والے افکار و خیالات الہام رحمانی اور عنایت ربانی ہیں جو ضرورت کے وقت نیک بندوں کے شامل حال ہوتے ہیں۔

یہاں پر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن نے شیطانی وسوسوں کو بھی اسی طرح کی وحی سے تعبیر کیا ہے: وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤی اَوْلِیٰٓـئِهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ (انعام/۱۲۱)

"اور بے شک شیاطین اپنے دوستوں کی طرف وحی (الہام) تو کرتے رہتے ہیں تا کہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔"

۴- رسالت و نبوت کی وحی : اس معنی میں استعمال ہوتی ہے کہ وحی نبوت

سے مخصوص ہے (قرآن مجید میں) ستر سے زیادہ مقامات پر اس کا تذکرہ ہوا ہے: ''وَ کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ قُرْآنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (شوریٰ/۷)

''اور اس طرح ہم نے آپ کی طرف عربی زبان میں قرآن نازل کیا تا کہ آپ مکہ اور اطراف کے لوگوں کو ڈرائیں۔''

پیغمبران خدا وہ باکمال ہستیاں ہیں جو اپنے اندر اس بات کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں کہ انہیں وحی کا مرکز بنایا جائے۔ امام حسن عسکریؑ فرماتے ہیں کہ ''خدا نے پیغمبرؐ کے روح وقلب کو سب سے بہتر اور حق وصداقت کو قبول کرنے کے لئے سب سے مناسب پایا تو آپ کو نبوت کے لئے منتخب کر لیا۔

(بحار الانوار، ج ۱۸/ص ۲۰۵/ح ۲۶)

پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ خدا نے کسی بھی نبی کو مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ اس نے اپنی عقل کو منزل کمال تک پہونچا لیا ہو اور عقل وخرد کے اعتبار سے امت کے درمیان اس کی برتری ثابت ہو گئی ہو۔

(اصول کافی، ج ۱، ص ۱۳)

صدر الدین شیرازی کے بقول قبل اس کے کہ نبی کا ظاہر نبوت سے آراستہ ہو، آپ کا باطن حقیقت نبوت سے واقف تھا۔ الہام ہی کی طرح وحی بھی کچھ خاص موقعوں پر خدا کی طرف سے انسان کے دل پر نور کی بارش اور اس کی ہدایت وراہنمائی کو کہتے ہیں، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ جس پر الہام ہوتا ہے وہ مرکز الہام سے بے خبر ہوتا ہے جب کہ صاحبان وحی الٰہی یعنی انبیاء ومرسلینؑ اس مرکز وحی سے کلی طور پر آگاہ ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے انبیاءؑ آسمانی پیغام کے اخذ کرنے میں کبھی بھی حیرت یا غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتے۔ چونکہ وحی کے مرکز اور اسکے نزول کی کیفیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔

زرارہؒ نے امام صادقؑ سے پوچھا کہ پیغمبرؐ خدا کو کس طرح اطمینان ہوا کہ آپ تک پہونچنے والا پیغام وحی الٰہی ہے، وسوسہ شیطانی نہیں ہے امامؑ نے فرمایا: ''جب خداوند عالم کسی بندے کو نبوت کے لئے چنتا ہے تو اسے ایک خاص قسم کا سکون واطمینان عطا کر دیتا ہے۔ جس کے بعد حق

کی طرف سے پیغام رسانی اس کے لئے ویسے ہی ہو جاتی ہے جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔''

(بحار الانوار، ج ۱۸، ص ۲۶۲، ح ۱۶)

بعثت ونبوت کے سلسلہ میں ہر طرح کے شکوک وشبہات اور حیرت واستعجاب کا ازالہ کرنے کے لئے خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

''ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی نازل کی ہے جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے نبیوں کی طرف وحی کی تھی اور ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، اسباطؑ، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی کی ہے اور داؤدؑ کو زبور عطا کی ہے۔ کچھ رسول ہیں جن کی باتیں ہم آپ سے بتا چکے ہیں اور کچھ رسول ہیں جن کا تذکرہ ہم نے نہیں کیا ہے اور اللہ نے موسیٰؑ سے باقاعدہ گفتگو کی ہے۔ یہ سارے رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے، اس لئے بھیجے گئے تا کہ رسولؐ کے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خدا پر قائم نہ ہو سکے اور خدا سب پر غالب اور صاحب حکمت ہے، (یہ مانیں یا نہ مانیں) لیکن خدا نے جو کچھ آپ پر نازل کیا ہے وہ خود اس کا گواہ ہے کہ اس نے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور ملائکہ بھی گواہی دیتے ہیں اور خدا خود ہی شہادت کے لئے کافی ہے۔

''بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور راہ خدا میں مانع ہو گئے وہ گمراہی میں بہت دور تک چلے گئے ہیں۔'' (سورہ نساء، آیت ۱۶۳ تا ۱۶۷)

ان آیتوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ اس میں کوئی تعجب اور حیرت کی بات نہیں ہے کہ کسی انسان پر وحی نازل ہو کیوں کہ اس سے انسانیت مانوس اور تاریخ کے ہر دور میں وحی اس سے وابستہ رہی ہے۔

رسالت ونبوت کی وحی کے اقسام

قران کریم کی رو سے اس وحی کی تین قسمیں ہیں

(۱) **بلا واسطہ وحی** : یعنی براہ راست بلا کسی واسطے کے قلب رسولؐ پر وحی کا

نازل ہونا۔ پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں: "اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ یَنْفُثُ فِیْ رُوْعِی" (الاتقان ج/۱ص/۴۴)
یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ روح القدس جبریلؑ کے علاوہ کوئی اور ہستی ہے۔

(۲) **آواز پیدا کرنا** : پیغمبرؐ کے کانوں تک وحی کی آواز کا پہونچانا مگر اس طرح کہ آپ کے علاوہ کوئی اور نہ سن سکے، آواز سنائی دے مگر آواز دینے والا دکھائی نہ دے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے پردہ کے پیچھے سے کوئی گفتگو کرے۔ اسی وجہ سے اس کیفیت کو او من وراء حجاب "پس پردہ سے کہہ کے" بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ پر اسی طرح وحی نازل ہوئی خصوصاً کوہ طور پر۔ شب معراج پیغمبر اسلامؐ پر بھی وحی الٰہی کا نزول اسی طرح ہوا۔

(۳) **فرشتے کے ذریعہ** : روح پیغمبرؐ پر پیغام خدا کا نزول جبریلؑ کے ذریعہ انجام پاتا تھا چنانچہ قرآن مجید میں ملتا ہے :نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ "اسے روح الامین نے آپ کے دل پر نازل کیا۔" (شعراء، آیت ۱۹۳،۱۹۴)

نزول وحی کی کیفیت

جب پیغمبرؐ اسلام پر براہ راست وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کو اس قدر گرانی کا احساس ہوتا تھا کہ آپ کا پورا بدن گرم ہو جاتا تھا اور جبین مبارک سے پسینہ ٹپکنے لگتا تھا، آپ اس وقت اگر اونٹ یا گھوڑے پر سوار ہوتے تھے تو وہ سواری اس وقت اتنا جھک جاتی تھی کہ اس کا پیٹ تقریباً زمین سے لگ جاتا تھا۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ سورۂ مائدہ کے نزول کے وقت آپ "شہبا" نامی ناقہ پر سوار تھے، وحی کی گرانی سے ناقہ ٹھہر گیا اور اتنا خم ہو گیا کہ قریب تھا کہ اس کی ناف زمین سے متصل ہو جائے۔ اس وقت پیغمبرؐ اسلام کی حالت غیر ہو گئی تھی اور آپ اپنا ایک ہاتھ ایک صحابی کے سر پر رکھے ہوئے تھے۔ (تفسیر عیاشی ج۱، ص۳۸۸)

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ: نزول وحی کے موقع پر رسولؐ کا چہرہ اور بدن متغیر ہو جاتا تھا آپ اور آپ کے صحابہ اس وقت سروں کو جھکا لیتے تھے۔ (طبقات ابن سعد ج/۱ص/۱۳۱)

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ نزول وحی کے وقت اگر پیغمبرؐ کا زانو کسی کے زانو سے متصل ہوتا تھا تو زانوئے پیغمبرؐ کی گرانی اس کے لئے نا قابل برداشت ہو جاتی تھی۔ چونکہ ہم وحی کی حقیقت سے ناواقف ہیں اس لئے یہ سمجھنے میں بہر حال عاجز ہیں کہ نزول وحی کے وقت حضورؐ پر یہ حالات کیوں طاری ہوتے تھے۔ مزید تفصیلات کے لئے وحی اور اس کی کیفیت کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ التمہید فی علوم القرآن ج/۱ص/۶۲ کے بعد سے اس موضوع پر قدرے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

سوالات

۱۔ لغوی اعتبار سے وحی کی تعریف کرتے ہوئے بتایئے کہ قرآن مجید میں وحی کا استعمال کن معنوں میں ہوا ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل آیت میں وحی کا کیا مطلب ہے؟ ''وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلیٰ اَوْلِیٰٓئِھِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ...'' انعام/۱۲۱؟

۳۔ وحی الہام ہی کی طرح ہے، پھر انبیاءؑ وحی کے اخذ کرنے میں کبھی بھی تعجب یا غلطی سے دوچار کیوں نہیں ہوئے؟

۴۔ رسالت ونبوت سے مخصوص وحی کے اقسام مع تعریف بیان کیجئے؟

۵۔ براہ راست نزول وحی کے موقع پر پیغمبر کی کیا حالت ہوتی تھی؟

تیسرا سبق

نزول قرآن

قرآن مجید ان آیات اور سوروں کا مجموعہ ہے جو پیغمبر اسلامؐ پر ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے بعد مختلف حالات میں نازل ہوئے۔ قرآن کریم رفتہ رفتہ ایک ایک آیت یا ایک ایک سورے کی شکل میں نازل ہوا اور یہ سلسلہ پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دنوں تک جاری رہا۔ پیغمبرؐ کے زمانے میں درپیش حالات کی مناسبت سے اور مشکلات کو دور کرنے کے لئے یا سوالوں کے جوابات دینے کے لئے کچھ آیات یا کسی ایک سورے کا نزول ہو جاتا تھا۔ قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابوں میں یہی فرق ہے کہ قرآن بیک وقت اور ترتیب وار نازل نہیں ہوا جبکہ دوسری کتابیں ایک ساتھ یعنی مجموعہ کی شکل میں نازل ہوئیں مثلاً الواح موسیٰؑ اور صحف ابرہیمؑ وغیرہ۔ اسی بات کو بہانہ بنا کر کفار ومشرکین پیغمبرؐ اسلام کو تنقید اور عیب جوئی کا نشانہ بناتے تھے:

''وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْہِ الْقُرْآنُ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً'' (فرقان/۳۲)

''کفار کہتے ہیں کہ آخر ان پر ایک ہی دفعہ کل کا کل قرآن کیوں نہیں نازل ہو گیا؟''

اللہ نے مشرکین کا جواب دیتے ہوئے ''نزول تدریجی'' کا فلسفہ اس انداز سے بیان فرمایا:

''کَذٰلِکَ لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ وَرَتَّلْنٰہُ تَرْتِیْلاً'' (فرقان/۳۲)

ایسا اسی وجہ سے ہے تاکہ ہم آپ کے دل کو سکون واطمینان عطا کر سکیں اور ہم نے اسے (یکبارگی کے بجائے) آہستہ آہستہ نازل کیا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

''وَقُرْآناً فَرَقْنٰہُ لِتَقْرَاَہُ عَلَی النَّاسِ عَلیٰ مُکْثٍ وَّنَزَّلْنٰہُ تَنْزِیْلاً'' (اسراء/۱۰۶)

"اور ہم نے قرآن کو جز جز نازل کیا ہے تا کہ تم تھوڑا تھوڑا لوگوں کے سامنے پڑھو اور ہم نے اسے دھیرے دھیرے نازل کیا ہے۔"

قرانی آیات کے پس منظر میں "نزول تدریجی" (دھیرے دھیرے نازل ہونا) کا فلسفہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ اسلام اور مسلمانوں کو یہ احساس رہے کہ اللہ کی مخصوص عنایت ہر وقت ان کے شامل حال ہے اور اللہ سے ان کا رابطہ ہر لحہ ہمیشہ برقرار ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے نازک حالات میں آیتوں کا نزول رسولؐ کی دلجوئی کا سبب بن جاتا تھا۔

نزول کا آغاز

قرآن مجید نے اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ نزول قرآن کا آغاز رمضان المبارک شب قدر میں ہوا:

"شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ" (بقرہ/۱۸۵)

ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا: "اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ" (قدر/۱)

"ہم نے قرآن شب قدر میں نازل فرمایا۔"

شیعوں کے نزدیک ماہ رمضان کی اکیسویں یا تیئیسویں رات شب قدر ہے۔

شیخ کلینیؒ نے حسان بن مہران سے روایت کی ہے کہ انھوں نے امام صادقؑ سے شب قدر کے بارے میں دریافت کیا تو امامؑ نے فرمایا کہ انیسویں شب میں انسانوں سے متعلق مسائل مقدر ہوتے ہیں، اکیسویں رات میں معیّن ہوتے ہیں اور تیئیسویں رات میں ان پر مہر لگتی ہے۔

(وسائل الشیعہ، ج ۷ ابواب احکام شہر رمضان باب ۳۲، ح ۱، ۲)

شیخ صدوقؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں کا فیصلہ ہے کہ ماہ رمضان کی تیئیسویں رات شب قدر ہے۔ (الخصال، ج ۲، ص ۱۰۲، التمہید، ج ۱، ص ۱۰۸، ۱۰۹)

تین سال کا وقفہ

پیغمبرؐ اسلام ہجرت سے ۱۳ سال پہلے ۶۰۹ء میں ۲۷ رجب کو نزول وحی کے بعد مبعوث بہ رسالت ہوئے لیکن ایک آسمانی کتاب کے عنوان سے نزول قرآن کا آغاز تین سال کے بعد ہوا۔ اس تین سالہ وقفہ کو "فترت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مدت میں پیغمبرؐ خفیہ طور پر تبلیغ دین میں مشغول رہے یہاں تک کہ یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی: "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" (حجر/۹۴)

اس آیت کے ذریعہ رسولؐ کو اعلانیہ تبلیغ کا حکم ملا۔

ابوعبداللہ زنجانی کے بقول: "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ" (علق/۱) کے نازل ہونے کے بعد تین سال تک نزول قرآن کا سلسلہ رہا۔ اس تین سال کی مدت کو "فترت وحی" کا زمانہ کہا جاتا ہے اس کے بعد تدریجی طور پر دوبارہ نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا۔

قرآن کتنے عرصہ میں نازل ہوا؟

تدریجی طور پر نزول قرآن کی مدت ۲۰ سال ہے۔ بعثت کے تین سال بعد نزول قرآن کا آغاز ہوا اور پیغمبرؐ کی حیات طیبہ کے آخری سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس مقام پر تین سوال ابھرتے ہیں:

(۱) یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا شب قدر سے ہو جبکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ ۲۷ رجب کو رسولؐ پر سورۂ علق کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں اور اسی کے بعد آپ مبعوث برسالت ہوئے؟

(۲) اگر پیغمبرؐ اسلام پر سب سے پہلے سورۂ علق کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو پھر "فاتحۃ الکتاب" سورۂ حمد کو کیوں کہا جاتا ہے؟

(۳) اگر قرآن مجید میں ۲۰ سال کے عرصہ میں مختلف حالات اور مواقع کے پیش نظر آہستہ

آہستہ حضورؐ پر نازل ہوا، تو شب قدر میں پورے قرآن کے نزول کا کیا مطلب ہے؟

ان سوالوں کے جواب کچھ اس طرح ہیں

جواب نمبر۱۔ بعثت کے تین سال بعد نزول قرآن کا آغاز ہوا۔ بعثت کے موقع پر نازل ہونے والی سورۂ علق کی ۵ آیتوں پر قرآن کا اطلاق سورۂ علق کی تکمیل کے بعد سے ہوتا ہے۔ نزول قرآن کا آغاز اس وقت سے ہوا جب آیۂ "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" کا نزول ہوا جس کے بعد رسولؐ علی الاعلان تبلیغ پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد سے وفات رسول تک مسلسل آیتوں اور سوروں کا نزول ہوتا رہا۔

جواب نمبر۲۔ اگر پیغمبرؐ کے زمانے میں سورہ محمد پر فاتحۃ الکتاب کا اطلاق ہوتا تھا تو اس وجہ سے کہ حضورؐ پر نازل ہونے والا پہلا سورہ تھا۔ اس کے علاوہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعثت کے پہلے ہی دن جبرئیلؑ نے رسولؐ کو اسلامی دستور العمل کے مطابق وضو اور نماز کا طریقہ بتایا اور چونکہ "لاَ صَلٰوۃَ اِلاَّ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ" یعنی "سورہ محمد کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی۔"

یہ اسلام کا قانون ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ بعثت ہی کے موقع پر پورا سورہ محمد نازل ہو گیا تھا۔

جواب نمبر۳۔ ظاہری اعتراض کے پیش نظر اس سوال کے جواب میں بہت سے اقوال مختلف نظریات بیان ہوتے ہیں ان میں کچھ ملاحظہ فرمائیں:

پہلا نظریہ : پورا قرآن شب قدر میں نازل نہیں ہوا ہے، بلکہ نزول قرآن کا آغاز شب قدر سے ہوا ہے جیسا کہ اس آیت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے: "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ" (سورۂ بقرہ/۱۸۵)

"ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔" اکثر محققین نے اسی نظریہ کو اپنایا ہے اس لئے کہ نزول قرآن کے زمانے کے لوگ لفظ قرآن سے پورا قرآن نہیں سمجھتے تھے۔

اس سے قطع نظر خود قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں جو ایک جگہ اور ایک رات میں

نازل نہیں ہو سکتیں، مثلاً قرآن مجید میں ایسے گذشتہ واقعات کی خبریں موجود ہیں جو پہلی شب قدر کی بہ نسبت بہت آگے کی بات ہے یعنی جن کا پہلی شب قدر کے بہت عرصہ بعد سے تعلق ہے۔ مثال کے طور پر یہ آیت دیکھیں: "وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ....." (آل عمران/۱۲۳)

خدا نے جنگ بدر میں تمہاری نصرت و امداد کی جب کہ تم ضعیف و ناتواں تھے۔ یہ آیت اگر پہلی شب قدر میں نازل ہوئی ہوتی، تو اسے مستقبل کی شکل میں نازل ہونا چاہئے تھا، ورنہ بات حقیقت اور واقعیت کے خلاف ہو جائے گی۔

اس استدلال سے قطع نظر، قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ، مبہم و مبین اور عام و خاص کا وجود بھی اس نظریہ کی تائید کرتا ہے کہ پورا قرآن یکبارگی نازل نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی آیت کا ناسخ یا مبین ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ منسوخ اور مبہم پہلے سے موجود ہوں۔ پس یہ بات ہرگز معقول نہیں ہے کہ موجودہ قرآن یکجا نازل ہوا۔

دوسرا نظریہ : کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ پورے سال کی ضرورت کے مطابق شب قدر میں یکبارگی پیغمبرؐ اسلام پر قرآن نازل ہو جاتا تھا۔ پھر دوران سال حالات اور ضروریات کے پیش نظر وہی قرآن آہستہ آہستہ پیغمبرؐ پر نازل ہوتا تھا۔ اس خیال کی رو سے نزول قرآن کے لئے ماہ رمضان اور شب قدر زیر بحث ہے۔ اس سے مراد پیغمبرؐ اسلام کی حیات طیبہ کا ہر رمضان اور ہر شب قدر ہے، نہ کہ کوئی ایک رمضان یا ایک شب قدر۔

(تفسیر کبیر رازی، ج۵، ص۸۵، الدر المنثور، ج۱، ص۱۸۹، تفسیر طبری، ج۲، ص۲۷۶، الاتقان، ج۱، ص۴۰)

تیسرا نظریہ : قرآن کے دو نزول ہیں ۱۔ نزول دفعی ۲۔ نزول تدریجی،

شب قدر میں پورا قرآن ایک وقت میں حضور پر نازل ہو گیا۔ پھر دھیرے دھیرے دوران نبوت نازل ہوتا رہا۔ اس نظریہ کی بنیاد نزول قرآن کے سلسلہ میں وارد ہوئیں روایات ہیں۔ روایات اہلسنت کے مطابق قرآن مجید عرش الٰہی سے یکبارگی یکجا طور سے پہلے آسمان پر موجود

"بیت العزہ" نامی مقام پر نازل ہوا جب کہ شیعی روایات کی رو سے قرآن مجید عرش الٰہی سے چوتھے آسمان پر "بیت المعمور" نامی جگہ پر نازل ہوا۔ یہ بات فقط نزول دفعی کے سلسلہ میں ہے ورنہ تدریجی طور پر قرآن ۲۰ سال کے عرصہ میں نازل ہوا۔ نزول دفعی اور نزول تدریجی کے سلسلہ میں اہل علم حضرات نے جو توجیہات بیان کی ہیں ان میں سے کچھ ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ شب قدر میں پیغمبرؐ اسلام پر پورا قرآن نازل کیا گیا تا کہ آپ قرآن مجید کے تمام مندرجات اور مفہوم سے اسی وقت آگاہ ہو جائیں۔ یہ تاویل شیخ صدوقؒ کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "شب قدر میں قرآن کی عبارتیں اور اس کے الفاظ حضورؐ پر نازل نہیں ہوئے بلکہ آپ کو فقط علم قرآن سے نوازا گیا اور اجمالی طور پر اس کے مندرجات سے آگاہ کیا گیا۔"

۲۔ ابوعبداللہ زنجانی کہتے ہیں: شب قدر میں پیغمبرؐ اسلام کے پاک و پاکیزہ دل پر حقیقت قرآن کی تجلی ہوئی جو قرآن کا اہم اور بنیادی نشانہ ہے۔ یہی حقیقت قرآن بعد میں آپ کی زبان مبارک پر الفاظ قرآن کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

۳۔ علامہ طباطبائیؒ مذکورہ نظریہ کو مزید حسین و دل آویز لہجے میں یوں بیان فرماتے ہیں:

"درحقیقت قرآن کا حقیقی وجود اس کے ظاہری وجود کے پس پردہ چھپا ہوا ہے، جو سطحی اور عمومی زاویہ نظر سے ناقابل فہم ہے۔ قرآن کے وجود حقیقی میں نہ جز ہے، نہ فصل، نہ آیت ہے، نہ سورہ بلکہ وہ ایک دوسرے سے متصل اور پائدار اور وحدت حقیقی ہے جو بہت عظیم الشان، عالی مرتبت ہے اور عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔ لہٰذا قرآن کے دو وجود ہیں:

۱) الفاظ و عبارات کے قالب میں نظر آنے والا ظاہری وجود

۲) اپنے حقیقی مقام پر موجود باطنی وجود۔

قرآن مجید اپنے حقیقی اور باطنی وجود کے ساتھ شب قدر میں یکجا قلب پیغمبرؐ پر نازل ہو گیا۔ پھر زمانہ نبوت کے دوران آہستہ آہستہ مختلف موقعوں پر ۲۳ سال کے عرصہ میں اس کا ظاہری وجود

حضورؐ پر نازل ہوتا رہا۔ (المیزان، ج ۲، ص ۱۵۔۱۶)

البتہ ہو سکتا ہے اس طرح کی تاویلات جن میں ایک خاص قسم کی جلالت اور کشش پائی جاتی ہے، مکمل طور پر صحیح ہوں بشرطیکہ خارجی دنیا میں اسے پایۂ ثبوت تک پہنچایا جا سکے۔ بہر حال یہ تمام نظریات فکر انگیز اور قابل بحث ہیں لیکن وہ نظریہ جو سب سے زیادہ صحیح، حقیقت سے قریب اور ظاہر قرآن سے ہماہنگ ہے، وہی پہلا والا یعنی شیخ مفیدؒ کا نظریہ ہے جس کی رو سے نزول قرآن کا آغاز شب قدر یعنی ماہ رمضان سے ہوا ہے۔

سوالات

۱۔نزول قرآن کی ابتدا کس رات سے ہوئی؟ نزول تدریجی کا فلسفہ کیا ہے؟

۲۔پیغمبر اکرم پر بعنوان قرآن نازل ہونے والی سب سے پہلی آیت کون سی ہے؟ اس کے نزول کا سال بھی بتایئے؟

۳۔نزول قرآن کے باب میں عہد ''فترت'' سے کیا مراد ہے؟ اس کی ابتدا اور انتہا کن آیتوں سے ہوئی؟

۴۔پیغمبر اکرمؐ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات کے نازل ہونے کے بعد ۲۷ رجب کو مبعوث برسالت ہوئے پھر نزول قرآن کا آغاز شب قدر سے کیوں کر ہوا؟

۵۔سورہ محمد کو فاتحۃ الکتاب کیوں کہتے ہیں؟

۶۔یہ بات کیسے تسلیم کی جائے کہ پورا قرآن شب قدر میں نازل ہوا جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ قرآن مجید حالات و واقعات کے پیش نظر بیس سال کے عرصہ میں دھیرے دھیرے نازل ہوا اس سلسلہ میں بیان کئے گئے تینوں نظریئے لکھئے؟

۷۔نزول دفعی اور نزول تدریجی کے بارے میں شیخ مفیدؒ کا نظریہ کیا ہے؟

چوتھا سبق

اسباب نزول

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید مختلف حالات اور موقعوں کے پیش نظر زمانہ بعثت کے دوران نازل ہوا۔ بہت سی آیتیں وقت اور ماحول کے تقاضے کے مطابق نازل ہوئیں، مثلاً کسی حادثہ یا مشکل کے وقت یا کسی سوال کا جواب دینے کے لئے انہی حالات، وجوہات اور مواقع کو ''شان نزول'' یا ''اسباب نزول'' کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ مختلف مواقع یا حالات میں نازل ہونے والی آیات انہی موقعوں اور حالات کے مطابق ہوتی تھیں۔ لہٰذا اگر آیت کے لفظ یا مفہوم میں کوئی مشکل یا ابہام نظر آئے تو نزول آیت کو موقع اور ماحول پر نظر رکھ کر اسے بآسانی دور کیا جاسکتا ہے۔ اسی بنا پر کسی بھی آیت کی مکمل تفسیر جاننے کے لئے اس کے سبب نزول اور شان نزول کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، مثال کے طور پر ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ... (بقرہ/۱۵۸)

''بیشک صفا و مروہ نام کی پہاڑیاں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص بھی حج یا عمرہ کرے اس کے لئے کوئی حرج نہیں کہ ان کا طواف کرے۔''

اس آیت کے سلسلہ میں یہ اعتراض ہوا ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی ارکان حج میں سے ہے تو کیوں اس سعی کے لئے ''لَا جُنَاحَ'' یعنی ''کوئی حرج نہیں ہے'' کی تعبیر استعمال ہوئی (جناح گناہ کا معرب ہے) بظاہر آیت سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی گناہ نہیں ہے۔ یہ عبارت صرف سعی کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ سعی واجبات میں سے ہے۔

شان نزول پر نظر ڈالنے سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ عبارت درحقیقت گناہ کا وہم برطرف کرنے کے لئے ہی استعمال ہوئی ہے مگر کیوں؟ تفصیل ملاحظہ ہو:

ہجرت کے چھٹے سال صلح حدیبیہ کے بعد یہ طے پایا کہ پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے اصحاب عمرہ بجالانے کے لئے اگلے سال مکہ تشریف لے جائیں گے۔ صلح نامہ کے شرائط کی رو سے مشرکین مکہ پر لازم تھا کہ خانۂ کعبہ کے اطراف اور صفا و مروہ سے تین دنوں کے لئے اپنے بتوں کو ہٹالیں تا کہ مسلمان بے ہچک اور بے خوف ہو کر طواف اور سعی بجالاسکیں اور ہوا بھی ایسا ہی، مگر بعض وجوہات کی بنا پر کچھ مسلمان مذکورہ مدت میں سعی نہ کر سکے اور پھر دوبارہ بتوں کے نصب کر دیئے جانے کے بعد انہیں سعی کے حرام ہونے کا خدشہ اور گمان ہونے لگا۔ لہٰذا اس وہم و گمان کو دور کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی تا کہ مسلمان سعی سے محروم نہ رہ جائیں، کیونکہ سعی حقیقت میں اللہ کی نشانیوں میں سے ہے اور بتوں کا وجود ایک عارضی صورت حال ہے جس سے سعی متاثر نہیں ہو سکتی۔

(تفسیر عیاشی، ج۱، ص۷۰)

جیسا کہ ابھی بھی ہم نے دیکھا کہ شان نزول کی طرف رجوع کرنے سے اس آیت کا مفہوم بالکل واضح ہو گیا۔ بالفاظ دیگر اس آیت کا سعی کے واجب یا جائز ہونے سے کوئی سروکار نہیں بلکہ اس آیت کے ذریعہ بتوں کی موجودگی میں حرمت سعی کے شک کا ازالہ کیا گیا ہے۔

سبب نزول یا شان نزول

ان دونوں (سبب نزول اور شان نزول) میں کیا فرق ہے؟ اکثر مفسرین کے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ ہر وہ مناسبت کہ جس کی بنا پر ایک یا ایک سے زیادہ آیتیں نازل ہوئی ہوں، اسے کبھی سبب نزول اور کبھی شان نزول کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب کہ ان دونوں کے درمیان میں فرق پایا جاتا ہے۔ درحقیقت شان نزول کا مفہوم سبب نزول سے زیادہ عام اور وسیع ہے۔ وہ اس طرح کہ ماضی، حال یا مستقبل میں سے کسی بھی زمانے میں واقعات افراد یا فرائض و

احکام کے سلسلہ میں نازل ہونے والی آیات کو شان نزول کہا جاتا ہے مگر سبب نزول فقط اسی واقعہ اور حادثہ کو کہتے ہیں جس کے فوراً بعد آیت نازل ہو جائے۔ بالفاظ دیگر وہی واقعہ نزول آیت کا سبب قرار پایا ہو۔

تنزیل و تاویل

گذشتہ علماء کی اصطلاح میں ''تنزیل'' نزول کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ کوئی خاص واقعہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو آیت کے نزول کا سبب ہوا ہے۔

تاویل آیت سے حاصل ہونے والا وہ عام مفہوم ہے جو اسی جیسے دوسرے حالات پر منطبق ہو سکے۔ بعض دوسری تعبیروں میں ان دونوں اصطلاحوں ''ظہر و بطن'' بھی کہا گیا ہے کہ ''ظہر'' سے مراد تنزیل اور بطن سے مراد تاویل ہے۔ چونکہ ظاہر آیت اور بطن آیت میں وسیع تر مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے۔

''مَا فِی الْقُرْآنِ آیَةٌ اِلَّا وَلَهَا ظَهْرٌ وَ بَطْنٌ'' قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت نہیں جس کا ظاہر و باطن نہ ہو۔ (رسول اکرمؐ) فضیل بن یسار نے امام صادقؑ سے اس مشہور و معروف حدیث کا مطلب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

بطن اسکی تاویل ہے بعض تاویلیں ماضی میں سامنے آچکی ہیں جب کہ کچھ ابھی تک سامنے نہیں آئیں (قرآن ہمیشہ زندہ و جاوید اور فیض بخش ہے) یہ سورج اور چاند کے مانند متحرک اور جاری و ساری ہے۔ (بصائر الدرجات، ص۱۹۶، حدیث/۷)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''ظہر قرآن'' ان لوگوں کے شامل حال ہے جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے اور ''بطن'' ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا کردار ان کے جیسا ہے۔

(تفسیر عیاشی، ج۱، ص۱۱، ح/۴)

فقہاء نے آیات کی تنزیل و تاویل اور شان نزول کو مدنظر رکھ کے ایک قاعدہ بنایا ہے جس کے مطابق آیات کے مفہوم اور اس کے دائرے میں وسعت اور عمومیت پیدا ہو جاتی ہے اور آیت اس

خاص جگہ یا موقع کے خصوصیت (کے دائرے) سے باہر ہے کہ جس کے بارے میں نازل ہوئی ہے یعنی چاہے آیت کسی خاص سبب کی بنا پر نازل ہوئی ہو لیکن اگر اس کے معنی میں عمومیت پائی جاتی ہو تو اس کا استعمال عام ہوگا، صرف انہی افراد سے مخصوص نہیں ہوگا جن کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ایک فقیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ نزول سے متعلق خصوصیات سے آگے بڑھ کر آیت کے عمومی پہلو سے استفادہ کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسباب نزول آیت کے متن کی دلالت سمجھنے میں مفید اور مؤثر ہوتے ہیں لیکن وہ قطعاً اس بات پر دلالت نہیں کرتے کہ آیت انہیں اسباب تک محدود ہے۔ چونکہ قوانین الٰہی عمومی ہیں، ہمیشہ اور ہر زمانے کی ضرورت ہیں، اس بنا پر لفظ کی عمومیت معتبر ہے نہ کہ موقع اور محل کی خصوصیت (یہ جملہ اس فقہی قاعدہ کا ترجمہ ہے "العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص المورد")

منظر ایلیا

اسباب نزول کا حصول کیسے؟

اسباب نزول تک رسائی بہت دشوار ہے۔ کیونکہ پہلے زمانہ کے علماء نے اس سلسلہ میں کافی مقدار میں قابل توجہ اور شایان شان مطالب جمع نہیں کئے۔ تحقیقی تحریریں جمع نہ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ کے لوگ حالات سے آگاہ تھے لہٰذا انہیں اپنی معلومات اور شواہد کو بطور سند یا ڈھال کے طور پر پیش کرنے کی چنداں ضرورت کا احساس نہیں تھا۔ بعد میں اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں فراہم ہوگئیں مگر ان میں سے زیادہ تر ضعیف اور غیر معتبر ہیں۔ درحقیقت ان روایات کے پیچھے خودغرضی کارفرما رہی ہے، خصوصاً بنی امیہ کی غاصب حکومت کے دوران ذاتی اغراض و مقاصد کے پیش نظر بناوٹی اسباب نزول کے سائے میں بہت سی آیتوں کی تفسیر و تاویل کی گئی۔

امام احمد بن حنبل سے منقول ہے کہ صدر اسلام کی جنگوں، آخری زمانہ کے فتنوں اور تفسیر و تاویل قرآن کے بارے میں نقل ہونے والی روایتیں حقیقت و صداقت پر مبنی نہیں ہیں۔

امام بدر الدین زرکشی نے بعض محققین سے نقل کیا ہے کہ احمد بن حنبل کے اس بیان کا

مقصد یہ ہے کہ ان موضوعات سے متعلق اکثر روایتیں غیر معتبر ہیں، نہ کہ ساری روایتیں۔

(البرہان ج/۲ ص/۱۵۶)

چونکہ اسباب نزول کے سمجھنے کا واحد راستہ نقل روایت ہے مگر افسوس کہ گذشتہ زمانے میں واقعات اور حوادث با قاعدہ طور پر محفوظ نہیں کئے گئے اور جو روایتیں نقل بھی ہوئیں، ان کے مصادر اکثر معتبر نہیں ہیں۔

واحدی اپنی مشہور و معروف کتاب "اسباب النزول" میں کہتے ہیں کہ جب تک صحیح اور قابل اعتماد روایت دستیاب نہ ہو، آیتوں کے اسباب نزول کے سلسلہ میں کچھ نہ کہنا چاہئے اور ضروری ہے کہ روایت، واقعات و حادثات کے عینی گواہوں سے نقل ہوئی ہو، ان لوگوں سے ہرگز نقل نہ ہوئی ہو جن کی باتیں قیاس آرائی و گمان اور افواہوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ تائید کے طور پر واحدی نے پیغمبر اسلام سے ابن عباس کی یہ روایت پیش کی ہے:

"علم و معرفت کے بغیر حدیثیں نقل کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ جو شخص بھی قرآن مجید یا میری طرف جھوٹی نسبت دے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے"

محمد بن سیرین کا بیان ہے کہ نامور تابعی عبیدہ سے میں نے ایک قرآنی آیت کی تفسیر پوچھی، تو ان کا جواب تھا کہ وہ لوگ اس دنیا سے گذر گئے جو شان نزول سے واقف تھے"

واحدی کے بقول اس زمانے میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو تفسیر و تاویل کے سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لیتے ہیں لہٰذا حقائق قرآن تک پہنچنے کے لئے سخت احتیاط کی ضرورت ہے"

(اسباب النزول ص/۴)

جلال الدین سیوطی اپنی تمام تر علمی صلاحیت اور مہارت کے باوجود اس سلسلہ میں فقط ۲۵۰ مستند حدیثیں جمع کر سکے، جن میں صحیح و غیر صحیح دونوں شامل ہیں۔ (الاتقان ج/۴ ص/۲۵۷، ۲۱۴)

لیکن خوش قسمتی سے کتب اہل بیت میں صحیح ذرائع سے حاصل ہونے والی بے شمار روایتیں

دستیاب ہیں اور اب تک ۴ ہزار سے زیادہ روایات اس سلسلہ میں جمع کی جا چکی ہیں (ان روایتوں کی جمع آوری آقائے برہان نے کی ہے جو دس جلدوں میں زیر طبع ہیں)

اسباب نزول کو سمجھنے کے لئے اس زمانہ میں دستیاب رائج اور قدرے قابل اطمینان ماخذات اور مصادر مندرجہ ذیل ہیں:

جامع البیان ۔طبری ،الدر المنثور۔سیوطی ،مجمع البیان ۔طبرسی ، تبیان ۔شیخ طوسیؒ ، اسباب النزول۔واحدی،لباب المنقول۔سیوطی

البتہ ان کتابوں میں صحیح وضعیف روایات آپس میں مخلوط ہیں،لہٰذا ضرورت ہے کہ ان کا بہت سخت گہرائی سے مطالعہ کیا جائے۔صحیح اور غیر صحیح کی پہچان مندرجہ ذیل طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔

(الف) ضروری ہے کہ سند روایت جس آخری شخص تک پہونچ کر ختم ہورہی ہے وہ معتبر اور قابل اطمینان ہو یعنی یا معصوم ہو یا بھروسہ والا صحابی جیسے عبداللہ بن مسعود،ابی بن کعب اور ابن عباس کہ جو قرآنی علوم میں ماہر اور امت میں مقبول ہیں یا پھر عالی مرتبہ تابعین میں سے ہوں جیسے مجاہد سعید بن جبیر اور سعید بن مسیب جو نہ تو اپنی طرف سے کچھ گڑھتے تھے اور نہ ہی غلط بیانی کا اردہ یا بدنیتی رکھتے تھے۔

(ب) تواتر یا نقل روایت کی کثرت ثابت ہو یعنی روایات کے الفاظ میں اختلاف کے باوجود اگر سب کا مضمون ایک ہو یا مضمون میں تھوڑے بہت اختلاف کے باوجود ایک نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہو تو ایسی صورت میں مذکورہ خبر صحیح ہوگی۔

(ج) اسباب نزول کے باب میں وارد ہونے والی روایتیں یقینی اور قطعی طور پر اشکال و ابہام کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں کیونکہ خود یہی بات اس حدیث کی سچائی پر گواہ ہوگی، چاہے علم حدیث کی اصطلاح میں سندی اعتبار سے وہ روایت صحیح نہ ہو۔

سوالات

۱۔اسباب نزول کی تعریف کرتے ہوئے اس کا فائدہ بیان کیجئے؟

۲۔اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ (بقرہ/۱۵۸) اس آیت کی شان نزول کیا ہے اور بتایئے کہ "لاَ جُنَاحَ" سے کیا مراد ہے؟

۳۔شان نزول اور سبب نزول میں کیا فرق ہے؟

۴۔تنزیل وتاویل کی تعریف کیجئے اور اس کی ہم معنی اصطلاحوں کا نام بتایئے؟

۵۔اسباب نزول کی آگاہی آسان کیوں نہیں ہے؟

۶۔کچھ ایسی کتابوں کے نام بتایئے جو اسباب نزول کے بارے میں قدرے معتبر ہوں؟

۷۔اسباب نزول کے باب میں صحیح اور غیر صحیح روایتوں کی پہچان کیسے ہوگی؟

پانچواں سبق

کاتبین وحی

پیغمبرؐ اسلام بظاہر لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور نہ ہی اپنی قوم میں ایک پڑھے لکھے شخص کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ چونکہ لوگوں نے آپ کو کبھی بھی کچھ لکھتے یا پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لہٰذا آپ کو "امی" کہا کرتے تھے۔ قرآن مجید نے بھی آپ کو اسی لقب سے یاد کیا ہے۔

فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ

"اللہ اور اس کے امی پیغمبر پر ایمان لاؤ" (اعراف/۱۵۸)

عربی زبان میں "اُم" کا مطلب ماں ہوتا ہے اور امی جو ماں کی طرف منسوب ہو اس شخص کو کہتے ہیں۔

اُمی کا ایک اور مطلب بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ "اُمِّیٌ" جوام القریٰ یعنی شہر مکہ کی طرف منسوب ہے، اس شخص کو کہتے ہیں جو مکہ میں پیدا ہوا ہو۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی اس لفظ سے ماخوذ الفاظ استعمال ہوئے ہیں مثلاً هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ...

"وہ خدا وہی تو ہے جس نے امیین میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیجا۔" (جمعہ/۲)

ہوسکتا ہے اس آیت میں امیین سے مراد وہ لوگ ہوں جو مکہ کی طرف منسوب ہیں لیکن پہلا والا رجحان زیادہ مشہور ہے اور شہرت کی وجہ یہ ہے کہ:۔

پہلا رجحان: قرآن کی دوسری آیتوں سے زیادہ میل کھاتا ہے: "وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ (بقرہ/۷۸)

ان یہودیوں میں کچھ ایسے جاہل بھی ہیں جو توریت کو امیدوں کے علاوہ کچھ نہیں جانتے

اس آیت میں لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ یعنی کتاب کے سلسلہ میں کچھ نہیں جانتے "بظاہر" امیون کی تفسیر ہے۔

دوسرے یہ (نہ لکھنا نہ پڑھنا) قرآن کی اعجازی کیفیت کے عین مطابق ہے برخلاف اس کے کہ پڑھے لکھنے کی صلاحیت کا نہ ہونا۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ

"اور اے رسول آپ اس کتاب سے پہلے نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے ورنہ اہل باطل شک وشبہہ میں پڑ جاتے۔ (عنکبوت/۴۸)

یہ آیت اس بات کی دلیل تو ہے کہ حضورؐ کچھ پڑھتے لکھتے نہیں تھے لیکن اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور یہی کہ پیغمبرؐ لکھتے پڑھتے نہیں تھے۔ یہ معترضین اور باطل پرستوں کو خاموش کرنے کے لئے کافی ہے۔ چونکہ وہ رسولؐ کو تعلیم یافتہ نہیں سمجھتے تھے لہٰذا انہیں اعتراض کے دروازے بند نظر آتے تھے۔

شیخ طوسیؒ مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "اگرچہ مفسرین نے کہا ہے کہ حضورؐ لکھنا نہیں جانتے تھے مگر آیت قطعاً اس بات پر دلالت نہیں کرتی۔ آیت میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ حضورؐ نہ لکھتے نہ پڑھتے تھے۔ ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو لکھتے نہیں مگر ان میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ بظاہر اَن پڑھ محسوس ہوتے ہیں مگر وہ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ پس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ حضورؐ نہ تو کچھ لکھتے تھے، نہ پڑھتے تھے اور نہ ہی آپ کو اس کی عادت تھی۔" (التبیان ج/۸ ص/۱۹۳)

علامہ طباطبائی نے بھی اسی نظریہ کو اختیار کیا ہے۔ (المیزان ج/۱۶ ص/۱۴۵)

اس سے قطع نظر تعلیم یافتہ ہونا کمال ہے اور تعلیم سے دور ہونا نقص اور عیب ہے اور پیغمبرؐ کے سارے کمالات اللہ کی مخصوص عنایت کا نتیجہ تھے، کسی بھی کمال تک پہنچنے کے لئے آپ نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ پس ناممکن ہے کہ حضورؐ کی ذات والا صفات لکھنے اور پڑھنے

جیسے معمولی کمالات سے محروم ہو۔

مختلف وجوہات کی بنا پر چونکہ پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت کا اظہار رسولؐ کے لئے خلاف مصلحت تھا، لہٰذا بہت سے امور منجملہ کتابت وحی کے لئے حضورؐ کو کاتبوں کی ضرورت لاحق ہوتی۔ لہٰذا اس کام کے لئے آپ نے مکہ اور مدینہ میں ماہرین فن کتابت کا انتخاب فرمایا۔ حضورؐ نے مکہ میں سب سے پہلے خصوصیت سے وحی کی کتابت کی ذمہ داری حضرت علیؑ کو سونپی اور آپ کی زندگی کے آخری روز تک اس ذمہ داری کو نبھاتے رہے۔ پیغمبرؐ کی طرف سے بھی شدید اصرار تھا کہ آپ پر جو کچھ نازل ہوتا ہے اسے حضرت علیؑ تحریر فرمائیں تاکہ آپ قرآن مجید اور وحی الٰہی سے مکمل طور پر آگاہ رہیں۔

سلیم بن قیس ہلالی کہتے ہیں میں مسجد کوفہ میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھا لوگ آپ کو حلقہ میں لئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا: ''اے لوگو! مجھ سے سوالات کرنے میں دریغ نہ کرو جب تک میں تمہارے درمیان ہوں، جو پوچھنا ہو پوچھ لو، قسم بخدا کوئی بھی آیت نازل نہیں ہوئی مگر یہ کہ پیغمبرؐ نے میرے لئے اس کی تلاوت کی اور تاویل و تفسیر کی تعلیم دی۔'' ایک شخص نے پوچھا کہ نزول کے موقع پر اگر آپ موجود نہیں ہوتے تھے تو کیا کرتے تھے؟ حضرت علیؑ نے فرمایا: ''جب میں پیغمبرؐ اسلام کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو آپ فرماتے تھے کہ اے علیؑ، تمہاری غیر موجودگی میں فلاں فلاں آیت نازل ہوئی اور پھر مجھے اس کی تلاوت اور تفسیر و تاویل سے بہرہ مند فرما دیتے تھے۔''

(السقیفہ ص/۲۱۴۔۲۱۳)

مدینہ میں کتابت وحی کا شرف سب سے پہلے ابی بن کعب کو حاصل ہوا۔ یہ زمانۂ جاہلیت میں بھی کتابت کا ہنر جانتے تھے۔ ابی ابن کعب وہ صحابی ہیں جنہیں حضورؐ نے پورے قرآن سے واقف کرایا۔ عثمان کے زمانہ میں اتحاد مصاحف کمیٹی کا عہدہ انہیں کو سونپا گیا تھا اور اختلاف کے موقعوں پر ان کی بات کو حرف آخر سمجھ کر مسئلہ حل کر لیا جاتا تھا۔ (التمہید، ج/۱ص/۳۴۸،۳۴۰)

زید بن ثابت مدینے میں پیغمبرؐ کے پڑوسی تھے اور چونکہ لکھنا جانتے تھے لہٰذا ضرورت کے

وقت ابی بن کعب کی غیر موجودگی میں حضور کتابت کے لئے آپ کو بلا لیتے تھے، پھر آہستہ آہستہ آپ کی کتابت بھی رسمی ہوگئی۔ آپ نے پیغمبرؐ کے حکم سے عبرانی زبان بھی سیکھی تاکہ پیغمبرؐ کے پاس عبرانی زبان میں آنے والے خطوط کو پڑھ کر ان کا جواب لکھ سکیں۔ کتابت کے مسئلہ میں پیغمبرؐ اسلام سے زید کا رابطہ دوسرے اصحاب سے زیادہ تھا۔ آپ زیادہ تر خط و کتابت میں مصروف رہتے تھے۔ (مصاحف بجستانی ص/۳)

اس بنا پر کاتبین وحی میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ، ابی ابن کعب اور زید بن ثابت کے نام سرفہرست ہیں۔ دیگر کاتبین وحی دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ابن اثیر کے بقول ''عبداللہ ابن ارقم زہری'' بھی مستقل کاتب تھے۔ ان کی ذمہ داری رسولؐ کی طرف سے خط و کتابت تھی جب کہ معاہدوں اور صلح ناموں کی کتابت حضرت علیؑ کے ذمہ تھی۔

خلفائے ثلاثہ، زید ابن عوام، سعید ابن عاص کے بیٹے خالد اور ابان، حنظلہ اسیدی، علاء بن حضرمی، خالد بن ولید، عبداللہ بن رواحہ، محمد بن مسلمہ، عبداللہ بن ابی سلول، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن عاص، معاویہ بن ابی سفیان، جہم بن جہیم بن صلت، معیقب بن ابی فاطمہ اور شرحبیل بن حسنہ بھی کبھی کبھی پیغمبرؐ کے لئے کتابت میں شریک ہو جاتے تھے۔

بظاہر یہ لوگ عرب کے ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے جو لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے۔ لہٰذا ضرورت کے وقت کبھی کبھی پیغمبرؐ اسلام ان سے بھی کتابت کا کام لے لیا کرتے تھے، ورنہ رسمی اور مستقل کاتب کی حیثیت سے فقط حضرت علیؑ، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ ابن ارقم تھے۔

ابوعبداللہ زنجانی نے کاتبین وحی کی فہرست میں چالیس سے زیادہ لوگوں کو شامل کیا ہے۔

(تاریخ القرآن ص/۲۱۔۲۰)

بظاہر ان سے ہنگامی موقعوں پر کام لیا جاتا تھا۔

پیغمبرؐ کے زمانے کا دستور یہ تھا کہ ہر وہ چیز جس پر لکھنے کا امکان ہوتا تھا اسے کتابت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا مثلاً:

۱۔عُسب : (عَسیب کی جمع) کھجور کی شاخ۔ درخت خرما کی شاخوں کی درمیان لکڑی سے پتوں کو صاف کر کے کتابت کے کام میں لاتے تھے۔

۲۔لخاف : (لخف کی جمع) باریک اور سفید پتھر۔

۳۔رقاع : (رقعہ کی جمع) کھال، پتوں، یا کاغذ کے ٹکڑے۔

۴۔اُدُم : (ادیم کی جمع) لکھنے کے لئے تیار کی گئی کھال۔

آیتیں رسولؐ کے گھر میں محفوظ طور پر رکھ دی جاتی تھیں۔ جو صحابہ کسی ایک سورہ یا متعدد سوروں کے خواہاں ہوتے تھے، وہ پتوں یا کاغذات کے ٹکڑوں پر نقل کر کے اسے اپنے پاس رکھ لیتے۔ اور عام طور سے کپڑے کے خولوں میں محفوظ کر کے دیوار پر آویزاں کر دیا کرتے تھے۔ (التمہید ج/۱ص/۲۸۸)

ہر سورہ کی آیتیں نظم و ترتیب کے ساتھ لکھی جاتی تھیں۔ ہر سورہ کی ابتدا بسم اللہ سے ہوتی تھی اور دوسری بسم اللہ کا نزول اس سورے کے اختتام کی علامت ہوتا تھا۔ اس طرح تمام سورے ایک دوسرے سے علاحدہ معلوم ہوتے تھے، البتہ عہد رسالت میں سوروں کے درمیان ترتیب عمل میں نہیں آئی، سارے سورے مستقل اور الگ الگ تھے۔

سوالات

۱۔رسولؐ کے امی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا رسول لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے؟ وضاحت کیجئے۔

۲۔سرفہرست کاتبین وحی کے نام بتایئے؟

۳۔مکہ اور مدینہ میں سب سے پہلے کے کاتبین وحی کے نام بتایئے؟

۴۔رسولؐ کے زمانہ میں کتابت کا دستور کیا تھا؟ اس وقت لوگ کن چیزوں پر لکھتے تھے؟

۵۔نزول کے بعد آیتوں کی حفاظت کیسے ہوتی تھی؟

پیغمبرؐ اسلام اور اشراف عرب سے کچھ بزرگ عیادت کے لئے آئے اور مولائے کائناتؑ سے بچوں کی جلدی شفا کے لئے نذر کی خواہش کی۔ حضرت علیؑ نے تین روزوں کی نذر۔ کی حسنین علیہما السلام کے شفا پانے کے بعد نذر پوری کرنے کے لئے آپ نے روزے رکھنا شروع کئے۔ افطار کے لئے روٹیاں فراہم کیں۔ پہلے دن افطار کے وقت ایک مسکین نے دق الباب کر کے مدد کی درخواست کی۔ آپ نے روٹیاں اس کے حوالہ کر دیں۔ دوسرے دن یتیم نے مطالبہ کر لیا تو آپ نے اسے عطا کر دیا۔ تیسرے دن اسیر نے مانگ لیا تو آپ نے اسے بھی محروم نہیں رکھا۔ یہ تینوں روزے پانی سے افطار کئے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس سلسلہ میں مسلک اہل سنت اور مذہب اہل بیتؑ میں نقل حدیث کے اصول وضوابط پر پوری اترنے والی بہت سی روایات جمع کی ہیں جن پر زیادہ تر مفسرین کا اتفاق ہے۔ پھر آپ نے پورے سورۂ دہر کے مدنی ہونے پر معتبر اسناد سے ترتیب نزول سے متعلق روایات کو جمع کیا ہے۔ (تفسیر طبرسی ج/۱ص/۴۰۴ تا ۴۰۶، شواہد التنزیل ص/۳۱۵، ۲۲۹)

عبداللہ ابن زبیر اور ویسے دوسرے لوگوں کو جنہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ یہ فضیلت اہلبیتؑ سے مخصوص رہے، اس بات پر شدید اصرار تھا کہ پورا کا پورا سورۂ دہر مکہ میں نازل ہوا ہے۔

(الدر المنثور ج/۶ص/۲۹۷)

حالانکہ یہ لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ مکہ میں اسیر تھے ہی کہاں جو روٹیاں مانگنے آتے۔

(د) بہت سے قرآنی مسائل کا حل مکی و مدنی آیتوں یا سوروں کی پہچان پر منحصر ہے مثلاً نسخ کے باب میں آیہ "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً" "پس جو بھی ان عورتوں سے تمتع کرے ان کی اجرت انہیں بطور فریضہ دے دے۔" (نساء/۲۴) جو جواز متعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، کچھ لوگ اسے منسوخ مانتے ہیں اور اس کی ناسخ سورۂ مومنون کی ان آیتوں کو تصور کرتے ہیں: "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۙ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ" "اور اپنی شرمگاہوں

کی حفاظت کرنے والے ہیں، علاوہ اپنی بیویوں اور اپنے ہاتھوں کی ملکیت کنیزوں کے کہ ان کے معاملے میں ان پر کوئی الزام آنے والا نہیں ہے، پھر اس کے علاوہ جو کوئی راستہ تلاش کرے گا وہ زیادتی کرنے والا ہوگا۔ (مومنون/۵ تا ۷)

مذکورہ نظریہ مختلف دلائل کی بنا پر باطل ہے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ جن آیتوں کو ناسخ فرض کیا گیا ہے وہ سورۂ مومنون میں ہیں اور پورا سورۂ مومنون مکی ہے۔ کسی نے بھی مذکورہ آیتوں کو مکی ہونے سے مستثنیٰ نہیں کیا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت جو متعہ کے جواز پر دلالت کرتی ہے، وہ مدنی ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ مکی آیت مدنی آیت کو منسوخ نہیں کر سکتی کیونکہ منسوخ آیات کے لئے ناسخ پر مقدم ہونا بہر حال ضروری ہے۔

مکی اور مدنی سوروں کی شناخت کا معیار

ترتیب نزول کی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ چھیاسی سورے مکی اور اٹھائیس سورے مدنی ہیں تقسیم بندی کے تین معیار ہیں:

۱- **وقت اور زمانہ:** اکثر مفسرین کا نظریہ ہے کہ مکی اور مدنی ہونے کا معیار پیغمبرؐ اسلام کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت ہے۔ جو سورہ ہجرت سے پہلے نازل ہوا مکی ہے اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوا وہ مدنی ہے، چاہے وہ مدینے میں قیام کے دوران نازل ہوا ہو یا سفر وغیرہ میں، وہ سورے جو ہجرت کے بعد مکہ میں حج وعمرہ کے دوران یا فتح مکہ کے بعد نازل ہوئے، وہ بھی مدنی شمار ہوں گے کیونکہ ہجرت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔ چونکہ ہجرت کا معیار پیغمبرؐ اسلام کا مدینے میں ورود ہے لہٰذا جو آیتیں مکہ سے نکلنے کے بعد اور مدینہ پہونچنے سے پہلے راستہ میں نازل ہوئیں وہ مکی کہی جاتی ہیں۔

۲- **مکان و محل:** جو آیتیں مکہ اور اطراف مکہ میں نازل ہوئیں وہ مکی ہیں اور جو آیتیں مدینہ اور اس کے گرد ونواح میں نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں، خواہ ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے

بعد۔ پس جو آیتیں ان دو جگہوں کے علاوہ کسی اور مقام پر نازل ہوئیں وہ نہ مکی ہیں نہ مدنی۔

۳- **انداز خطاب** : جس سورے میں مشرکوں سے خطاب ہو، وہ مکی ہے اور جس میں مومنین سے خطاب ہو وہ مدنی ہے، کیونکہ مکہ میں اکثریت مشرکین کی تھی اور مدینہ میں اکثریت مومنین کی تھی۔ جیسا کہ اوپر کی سطروں میں کہا جاچکا ہے کہ زیادہ تر مفسرین نے ان تینوں میں سے پہلے معیار کو انتخاب کیا ہے۔

مکی اور مدنی سوروں کی علامتیں

مکی اور مدنی سوروں کی پہچان کے لئے کچھ علامتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے کوئی مستقل طور پر کوئی بھی جامع و مانع نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے سے مل کر ایک حد تک کارآمد ہیں۔

مکی و مدنی سوروں کی شناخت کے لئے کل تین کسوٹیاں ہیں:

الف) نص اور روایتیں

ب) آیت کی ظاہری صورت و علامت

ج) مضامین اور معانی

البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ مکی اور مدنی سوروں کے معیار اور ان کی علامتوں میں خلط و ملط نہ ہونے پائے۔ اس سلسلہ میں کچھ ماہرین فن کے نظریات اشارۃً پیش خدمت ہیں:

علامہ برہان الدین ابراہیم بن عمر بن ابراہیم جعبری (متوفی ۷۳۲ھ) کے بقول مکی اور مدنی سوروں کی پہچان کے دو راستے ہیں:

الف) سماعی، جو کہ احادیث و روایات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

ب) قیاسی، یہ تشخیص کے اصول و ضوابط سے اخذ کیا جاتا ہے۔

عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں ہر وہ سورہ جس میں "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" "کَلَّا" آیا ہو یا جس

کی ابتدا حروف مقطعات سے ہوئی ہو، سوائے سورۂ بقرہ، آل عمران اور رعد کے یا طویل سوروں کو چھوڑ کر جس سورے میں بھی حضرت آدمؑ اور ابلیس کا ذکر بیان ہوا ہو یا انبیاء اور گذشتہ امتوں کا تذکرہ ہوا ہو، وہ مکی ہے اور ہر وہ سورہ جس میں فرائض و احکام اور شرعی حدود بیان ہوئے ہوں وہ مدنی ہے۔

(البرہان ج/۱ص/۱۸۹)

مکی اور مدنی سوروں کی کچھ دوسری نشانیاں اور خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ آیات کا اور اسی طرح خود سورے کا چھوٹا ہونا معمولاً مکی ہونے کی نشاندہی کرتا اور اس کے برخلاف آیات اور سوروں کا طویل ہونا عام طور سے مدنی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ مکی سوروں کا لہجہ سخت ہے اس لئے کہ کفار و مشرکین سرکش اور حق کے مقابلہ میں ضدی اور کدورت رکھنے والے تھے اور مدینے میں زیادہ مومنین سے خطاب ہوتا تھا لہٰذا مدنی سوروں کا لہجہ نرم اور ہلکا ہے۔

۳۔ اصول دین، ایمان اور اسلام کی طرف دعوت کا تذکرہ مکی سوروں کی خصوصیات میں سے ہے جبکہ شریعت اسلام کی توضیح اور احکام دین کی تشریح زیادہ تر مدنی سوروں کی خصوصیت ہے۔

۴۔ اخلاقی اصول کی پابندی، عقیدہ کی سلامتی، کٹ حجتی اور سرکشی سے پرہیز کی نصیحت، مشرکوں کے باطل عقائد سے مقابلہ اور ان کے خرافاتی و بے بنیاد نظریات کی تنقیص کرنا مکی سوروں کے علامات میں سے ہے۔

لیکن اہل کتاب سے مقابلہ، انہیں معتدل عقائد و افکار کی دعوت اور اسی طرح منافقین سے مقابلہ اور ان کی خصوصیات کا اظہار مدنی سوروں کی پہچان ہے۔

۵۔ "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" کہہ کر خطاب زیادہ تر مکی اور "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" کے ذریعہ خطاب اکثر و بیشتر مدنی ہونے کی نشانی ہے۔

البتہ واضح رہے کہ یہ خصوصیات کلی طور پر نہیں پائی جاتیں یہ فقط کچھ سوروں پر منطبق ہوتی

ہیں۔ خصوصاً جب کئی علامتیں ایک ساتھ جمع ہو جائیں اور ان کے مقابل کوئی نص یعنی دلیل وغیرہ بھی نہ ہو، تو ان کے صحیح ہونے کا احتمال قوی ہو جاتا ہے اور یہ قابل اعتماد ہو جاتی ہیں اور نتیجتاً فقہی، تاریخی اور دوسرے میدانوں میں مفید ہو جاتی ہیں۔

المختصر، جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے کہ مدنی اور مکی سوروں کی پہچان کے تین طریقے ہیں:

۱۔ روایات و احادیث کا سہارا لیا جائے جسے سماعی کہتے ہیں۔

۲۔ ظاہر شواہد و قرائن پر اعتماد کیا جائے جیسے جملہ بندی، سجع و وزن یا آیات و سوروں کا چھوٹا بڑا ہونا۔

۳۔ آیت کے مندرجات اور مضمون کو معیار بنایا جائے مثلاً عقائد و احکام کا تذکرہ یا کفار و منافقین سے مقابلہ۔

ترتیب نزول

سوروں کی ترتیب نزول کے سلسلہ میں معتبر روایات موجود ہیں جن میں سے اکثر ابن عباس سے منقول ہیں۔ اس سلسلہ کی کچھ روایتیں "التمهيد في علوم القرآن" اور "علوم قرآنی" (یہ دونوں کتابیں آیۃ اللہ محمد ہادی معرفت کی تالیف ہیں۔ مترجم) میں نقل کی گئی ہیں۔

علامہ طبرسی اور دیگر ماہرین نے توجہ دلائی ہے کہ سوروں کی ترتیب نزول کا تعلق ہر سورہ کی ابتدا سے ہے۔ اگر ایک سورہ کی کچھ آیتیں نازل ہو جائیں مگر تکمیل سے پہلے ایک یا متعدد سورے بطور کامل نازل ہو جائیں پھر دوبارہ اس پہلے والے سورے کی بقیہ آیتیں نازل ہوں جب بھی ترتیب کے اعتبار سے وہی سورہ مقدم رہے گا جس کی کچھ آیتیں پہلے نازل ہو چکی ہیں مثلاً سورۂ علق کی پانچ آیتیں آغاز بعثت میں نازل ہو گئی تھیں اور بقیہ آیتیں کئی سال کے بعد نازل ہوئیں پھر بھی ترتیب نزول کے اعتبار سے سورۂ علق قرآن کا پہلا سورہ تسلیم کیا گیا ہے۔

مندرجہ ذیل سطروں میں آپ ترتیب نزول کے اعتبار سے مکی اور مدنی سوروں کا نقشہ ملاحظہ فرمائیں گے۔ واضح رہے کہ سوروں کی ترتیب ابن عباس کی روایت کے مطابق ہے اور اس کی تکمیل جابر ابن زید کی روایت سے ہوئی ہے۔ متعدد معتبر نسخوں سے اس کی تصحیح ہوئی ہے۔ اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ اس نقشے کی ترتیب میں وقت اور زمانے کے لحاظ سے ہجرت کے بعد رسولؐ کے مدینہ پہونچ جانے کو معیار بنایا گیا ہے:

مکی سورے چھیاسی عدد

ترتیب نزول	موجودہ ترتیب	سورہ کا نام	ترتیب نزول	موجودہ ترتیب	سورہ کا نام	ترتیب نزول	موجودہ ترتیب	سورہ کا نام
۱	۹۶	علق	۱۴	۱۰۰	عادیات	۲۷	۸۵	بروج
۲	۶۸	قلم	۱۵	۱۰۸	کوثر	۲۸	۹۵	تین
۳	۷۳	مزمل	۱۶	۱۰۲	تکاثر	۲۹	۱۰۶	قریش
۴	۷۴	مدثر	۱۷	۱۰۷	ماعون	۳۰	۱۰۱	قارعہ
۵	۱	فاتحہ	۱۸	۱۰۹	کافرون	۳۱	۷۵	قیامہ
۶	۱۱۱	مسد	۱۹	۱۰۵	فیل	۳۲	۱۰۴	ہمزہ
۷	۸۱	تکویر	۲۰	۱۱۳	فلق	۳۳	۷۷	مرسلات
۸	۸۷	اعلیٰ	۲۱	۱۱۴	ناس	۳۴	۵۰	ق
۹	۹۲	لیل	۲۲	۱۱۲	اخلاص	۳۵	۹۰	بلد
۱۰	۸۹	فجر	۲۳	۵۳	نجم	۳۶	۸۶	طارق
۱۱	۹۳	ضحیٰ	۲۴	۸۰	عبس	۳۷	۵۴	قمر
۱۲	۹۴	انشراح	۲۵	۹۷	قدر	۳۸	۳۸	ص
۱۳	۱۰۳	عصر	۲۶	۹۱	شمس	۳۹	۷	اعراف
۴۰	۷۲	جن	۵۶	۳۷	صافات	۷۲	۱۴	ابراہیم

۴۱	۳۶	یٰس	۵۷	۳۱	لقمان	۷۳	۱۲	انبیاء
۴۲	۲۵	فرقان	۵۸	۳۴	سبا	۷۴	۲۳	مومنون
۴۳	۳۵	فاطر	۵۹	۳۹	زمر	۷۵	۳۲	سجدہ
۴۴	۱۹	مریم	۶۰	۴۰	غافر	۷۶	۲۵	طور
۴۵	۲۰	طٰہٰ	۶۱	۴۱	فصلت	۷۷	۶۷	ملک
۴۶	۵۶.	واقعہ	۶۲	۴۲	شوریٰ	۷۸	۶۹	حاقہ
۴۷	۲۶	شعراء	۶۳	۴۳	زخرف	۷۹	۷۰	معارج
۴۸	۲۷	نمل	۶۴	۴۴	دخان	۸۰	۷۸	نباء
۴۹	۲۸	قصص	۶۵	۴۵	جاثیہ	۸۱	۷۹	نازعات
۵۰	۱۷	اسراء	۶۶	۴۶	احقاف	۸۲	۸۲	انفطار
۵۱	۱۰	یونس	۶۷	۵۱	ذاریات	۸۳	۸۴	انشقاق
۵۲	۱۱	ہود	۶۸	۸۸	غاشیہ	۸۴	۳۰	روم
۵۳	۱۲	یوسف	۶۹	۱۸	کہف	۸۵	۲۹	عنکبوت
۵۴	۱۵	حجر	۷۰	۱۶	نحل	۸۶	۸۳	مطففین
۵۵	۶	انعام	۷۱	۷۱	نوح	—	—	—
۵۶	۳۷	صافات	۷۲	۱۴	ابراہیم	—	—	—

مدنی سورے اٹھائیس عدد

۸۷	۲	بقرہ	۹۷	۵۵	رحمٰن	۱۰۷	۴۹	حجرات
۸۸	۸	انفال	۹۸	۷۶	انسان	۱۰۸	۶۶	تحریم
۸۹	۳	آل عمران	۹۹	۶۵	طلاق	۱۰۹	۶۲	جمعہ
۹۰	۳۳	احزاب	۱۰۰	۹۸	بینہ	۱۱۰	۶۴	تغابن
۹۱	۶۰	ممتحنہ	۱۰۱	۵۹	حشر	۱۱۱	۶۱	صف
۹۲	۴	نساء	۱۰۲	۱۱۰	نصر	۱۱۲	۴۸	فتح
۹۳	۹۹	زلزال	۱۰۳	۲۴	نور	۱۱۳	۵	مائدہ
۹۴	۵۷	حدید	۱۰۴	۲۲	حج	۱۱۴	۹	توبہ
۹۵	۴۷	محمد	۱۰۵	۶۳	منافقون	—	—	—
۹۶	۱۳	رعد	۱۰۶	۵۸	مجادلہ	—	—	—

مکی اور مدنی سوروں کی یہ ترتیب ابن عباس کی روایت کے مطابق ہے جسے زرکشی اور طبری نے نقل کیا ہے اور جابر بن زید کی روایت سے اس کی تصحیح و تکمیل ہوئی ہے۔ پھر بھی تقریباً تیس سوروں کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ (ان تیس سوروں کے بارے میں "التمہید فی علوم القرآن" اور "علوم قرآنی" میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تفصیلات کے لئے ان کتابوں کا مطالعہ کیجئے)

بعض قدیم علماء کی کتابوں میں ملتا ہے کہ کچھ سوروں میں مکی اور مدنی آیتوں کی ردوبدل ہوگئی ہے۔ مکی سوروں میں کچھ مدنی آیتیں اور اسی طرح بعض مدنی سوروں میں کچھ مکی آیات شامل ہوگئی ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں ہونے والی تحقیقات اس نظریہ کو باطل قرار دیتی ہیں اور اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ مکی سوروں کی ساری آیتیں مکی اور مدنی سوروں کی ساری آیتیں مدنی ہیں۔ (التمہید فی علوم القرآن ج/۱ص/۱۳۷ اور ۱۶۹) بطور مثال ملاحظہ فرمالیں

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ ......، إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ (توبہ/۱۱۴،۱۱۳)

نبی اور صاحبان ایمان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے حق میں استغفار کریں چاہے وہ ان کے قرابتدار ہی کیوں نہ ہوں.....،...... یقیناً ابراہیم دردمند اور بردبار تھے۔"

یہ سورۂ توبہ کی آیتیں ہیں جس کا مدنی ہونا مسلم ہے مگر کچھ لوگوں نے کہا کہ مذکورہ آیتیں مکہ میں حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے موقع پر اس وقت نازل ہوئیں جب پیغمبر اسلامؐ آپ کے حق میں استغفار کا وعدہ کر چکے تھے۔

یہ ان لوگوں کا نظریہ ہے جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ کسی بھی طرح سے ثابت کر دیں کہ محسن اسلام حضرت ابوطالب حالت کفر میں اس دنیا سے گئے۔ (اس نظریہ کا بطلان روز روشن کی طرح واضح ہے بشرطیکہ تعصب کی عینک اتار کے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ طبرسی کا نظریہ صحیح ہے۔ (اور تاریخی حقائق کے مطابق ہے۔)
آپ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اکرمؐ سے مسلمانوں کے ایک گروہ نے اپنے مشرک آباء واجداد کے لئے استغفار کی اجازت مانگی تو یہ آیت نازل ہوئی اور واضح لفظوں میں اس کام سے روک دیا۔
(واضح رہے کہ سورۂ توبہ ۹ھ میں نازل ہوا اور حضرت ابوطالبؑ کی وفات ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی مگر کیا کیا جائے کہ تعصب اور عداوت اہلبیتؑ اچھے بھلے انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ مترجم)

سوالات

۱۔ مکی اور مدنی سوروں کے علم کا کیا فائدہ ہے؟ مثال دے کر واضح کیجئے۔
۲۔ مکی اور مدنی سوروں کی تقسیم بندی کے تینوں معیار بیان کیجئے۔
۳۔ مکی اور مدنی سوروں کی پہچان کے لئے کلی علامت بیان کیجئے۔
۴۔ وقت اور زمانہ کو معیار ماننے کی صورت میں مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ پہنچنے سے پہلے راستہ میں جو آیتیں نازل ہوئیں وہ مکی ہیں یا مدنی؟ جواب کی علت بھی بیان کیجئے۔
۵۔ مکی اور مدنی سوروں کی تقسیم بندی میں خطاب کو معیار قرار دینے کا کیا مطلب ہے؟ توضیح دیجئے۔
۶۔ مکی اور مدنی سوروں کی شناخت کے لئے چار خصوصیت ذکر کیجئے۔

ساتواں سبق

قرآن مجید کے نام اور صفات

قرآن مجید کے کتنے نام ہیں؟ علماء و مفسرین کے درمیان یہ ایک اختلافی موضوع ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے عظیم مفسر ابوالفتوح رازی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں قرآن مجید کے لئے ۴۳ نام بیان کئے ہیں (الروض الجنان وروح الجنان ج/۱ مقدمہ ص/۵) ان میں زیادہ تر صفت کا پہلو پایا جاتا ہے جبکہ علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں صرف چار ہی نام قرآن، فرقان، کتاب اور ذکر گنائے ہیں۔ (تفسیر طبری ج/۱ مقدمہ فن رابع ص/۱۴)

بدرالدین زرکشی ناقل ہیں کہ "حرالی" نے اس سلسلے میں ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں قرآن کریم کے ۹۰ سے زائد اسماء وصفات درج کئے ہیں۔

(البرہان ج/۱ ص/۲۷۳ تا ۲۷۶، الاتقان ج/۱ ص/۱۴۳ تا ۱۴۶)

قاضی عزیزی کے بقول قرآن کے ۵۵ نام اور عنوان ہیں۔ یہ اسماء مؤلف کی کتاب "علوم قرآنی" میں شواہد کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

مذکورہ ناموں سے چار نام خود قرآن مجید میں نام کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

۱۔ قرآن۔ "بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ" "یقیناً یہ بزرگ و برتر قرآن ہے۔" (بروج/۲۱)

۲۔ فرقان۔ "تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ ...." "بزرگ اور بابرکت

ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان (یعنی حق کو باطل سے جدا کرنے والی کتاب) نازل کیا۔"

(فرقان/۱)

۳۔ کتاب۔ "اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ" "ہم نے آپ پر یہ کتاب برحق نازل فرمائی۔" (نساء/۱۰۵)

۴۔ ذکر۔ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" "یہ قرآن ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکے محافظ ہیں۔" (حجر/۹)

لفظ قرآن کس سے ماخوذ ہے

لفظ قرآن مادہ (قرأ) سے ماخوذ ہے۔ قَرْأ دراصل قَرَوَ تھا۔ جس کے معنی جمع آوری ہے۔ چونکہ تلاوت کے وقت قاریٔ قرآن (بکھرے ہوئے) کلمات اور حروف کو یکجا کر دیتا ہے بالکل کتاب اور کتابت کے مانند کہ یہ بھی دراصل جمع آوری کے معنی میں ہے۔ (چونکہ کاتب بھی بکھرے ہوئے حروف اور کلمات کو یکجا کر دیتا ہے) لفظ قرآن کس سے مشتق ہوا ہے اس سلسلے میں علماء کے نظریات مختلف ہیں۔

اکثر علماء کا نظریہ ہے کہ یہ مادہ قَرْأ سے ماخوذ ہے جو دراصل قَرَوَ تھا۔

ابن فارس (متوفی ۳۹۵ ہجری) رقمطراز ہیں کہ "قرآن کا اصلی مادہ ق ر و یعنی قـــرو ہے جو جمع اور اکٹھا ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ قریہ یعنی بستی اسی سے بنا ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لوگ اِدھر اُدھر سے آکر اس ایک جگہ آباد ہو جاتے ہیں۔ چونکہ قرآن میں بھی احکام، عقائد، واقعات، اور دوسری بہت سی چیزیں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں، لہٰذا اسے بھی مادہ "قَرَوَ" سے ماخوذ مانا جاتا ہے۔

(معجم مقاییس اللغۃ ج/۵ ص/۷۸ تا ۷۹)

راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ ہجری) مادۂ قـــرو کی تشریح کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ "قرآن دراصل کفران، رجحان اور غفران کی طرح مصدر ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَ قُرۡاٰنَهٗ ،فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ"

"یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے جمع کریں اور پڑھوائیں، پھر جب ہم پڑھوا دیں تو آپ اس کی تلاوت کو دہرائیں۔"

(قیامت/١٧، ١٨)

یا مثلاً "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ..."

"آپ زوال آفتاب سے رات کی تاریکی تک نماز قائم کریں اور نماز صبح بھی کہ نماز صبح کے لئے گواہی کا انتظام کیا گیا ہے۔"

(اسراء/٧٨)

اور پھر یہی مصدر پیغمبرؐ اسلام پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب کے لئے علم اور اسم خاص ہو گیا کیونکہ یہ کتاب اپنے اندر تمام آسمانی کتابوں کی روح، مطالب اور نتائج کو سموئے ہوئے ہے۔

(مفردات ص/٤٠١، ٤٠٢)

خلاصۂ کلام یہ کہ قرآن مصدر ہے اسم مفعول کے معنی میں، جس کا مطلب ہے مَـا یُقۡـرَاُ (جس کو پڑھا جائے) اور یہی لفظ رسولؐ اسلام پر نازل ہوئی آسمانی کتاب کے لئے علم اور اسم خاص کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

لفظ قرآن خالص عربی زبان کا لفظ ہے۔ ان لوگوں کا نظریہ سراسر غلط ہے جو اس کی اصل سریانی زبان کے لفظ "قریانہ" تک پہنچاتے ہیں جو آسمانی نصوص اور آیات کی تلاوت کے معنی میں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شرقی زبانوں کے الفاظ بعض دوسری زبانوں سے ملتے جلتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ الفاظ دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ ہاں زبانوں کے الفاظ کا اشتراک دونوں زبانوں کی اصل اور جڑ کے ایک ہونے کی دلیل ضرور ہو سکتا ہے۔ ان ساری باتوں سے قطع نظر عین ممکن ہے کہ خود سریانی زبان کا یہ لفظ عربی زبان سے ماخوذ ہو۔ درحقیقت کسی بھی زبان کے اصلی اور دوسری زبانوں سے ماخوذ الفاظ کی شناخت کا معیار اشتقاق ہے جس لفظ کے مشتقات ہوتے ہیں اور خصوصاً کثیر تعداد میں وہ لفظ یقیناً اصل اور اسی زبان کا ہوتا ہے جیسے قرآن اور کتاب۔

سورہ کے لفظی معنی

سورۃ "سور" سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے شہر کی چہار دیواری۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس طرح چہار دیواری شہر کے گھروں کو اپنے حصار میں لئے ہوتی ہے، اسی طرح ہر سورہ بھی آیتوں کے ایک مجموعہ پر احاطہ کئے رہتا ہے۔

چونکہ مشہور ماہر لغات ابن فارس نے سورہ کے معنی بلندی اور برتری بھی بیان کئے ہیں لہٰذا کچھ علماء نے بھی سورہ کا یہی معنی بیان کیا ہے۔ انہی علماء میں سے بلند پایہ مفسر ابوالفتوح رازی بھی ہیں۔ تائید کے طور پر انھوں نے نابغہ ذبیانی کے اس شعر کا سہارا لیا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَعۡطَاکَ سُوۡرَةً   تَرَیٰ کُلَّ مَلۡکٍ دُوۡنَهَا یَتَذَبۡذَبُ

"خدا نے تجھے ایسی عظمت و منزلت بخشی ہے کہ اس کے سامنے ہر بادشاہ لرزہ براندام ہے۔"

ابوالفتوح کے بقول شہر کی دیوار کو بھی بلندی اور برتری ہی کے سبب "سـور" کہا جاتا ہے۔

(الروض الجنان ج/١ مقدمہ ص/٩)

بعض دوسرے علماء سورہ کو "سور" سے ماخوذ مانتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کا جز اور بچا ہوا حصہ۔ اس نظریہ کی رو سے سورہ قرآن کے جز اور حصے کے معنی میں دراصل سؤرہ تھا مگر تلفظ میں آسانی کے لئے اس کا ہمزہ واو سے تبدیل کر دیا گیا۔

آیت کے لفظی معنی

آیت نشانی کے معنی میں ہے اور قرآن کی ہر آیت قول خدا کی حقانیت کی علامت ہے۔ حافظ کے بقول "اللہ نے عرب کی روش سے ہٹ کر اپنی کتاب کا نام رکھا، عرب میں کسی شاعر کے مجموعہ کو دیوان اور اس دیوان کے اجزاء کو قصائد اور قصائد کے اجزاء کو ابیات کہا جاتا تھا مگر اللہ نے اپنی کتاب کو قرآن، اس کے اجزاء کو سورے اور سوروں کے اجزاء کو آیات کے نام سے یاد کیا ہے۔ (الاتقان ج/١ ص/١٤٣)

واضح رہے کہ ہر سورے کا کچھ آیتوں پر مشتمل ہونا ایک توفیقی امر ہے۔ کسی بھی سورے کی آیتوں میں کمی اور زیادتی پیغمبر کے حکم خاص سے انجام پائی ہے اور بغیر کسی ردوبدل کے آج تک اسی طرح باقی ہے۔ اس میں قرآن کے معجزہ ہونے اور آیتوں کے باہمی ربط وارتباط کا راز پوشیدہ ہے۔

اسی طرح سورہ کا نام سورہ اور آیت کا نام آیت خود قرآن مجید ہی نے انتخاب کیا ہے:۔

"سُوْرَةٌ اَنْزَلْنَا هَا وَ فَرَضْنَا هَا وَ اَنْزَلْنَافِيْهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ" یہ وہ سورہ ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے (اور اس پر عمل کرنا) ہم نے فرض کیا ہے اور اس میں واضح نشانیاں نازل کی ہیں۔

سوروں کے نام

آیتوں کی تعداد کی طرح ہر سورے کا نام بھی توقیفی ہے جو خود پیغمبرؐ کی صوابدید سے انجام پایا ہے۔ نام رکھنے کا یہ عمل دستور عرب کے مطابق اور معمولی سے معمولی مناسبت کی بنا پر وجود میں آیا ہے۔

بعض سوروں کی وجہ تسمیہ ذیل کے جدول میں بیان کی جارہی ہیں:۔

سورہ کا نام	وجہ تسمیہ
بقرہ (گائے)	اس سورے میں کافی تفصیل سے گائے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ سورۂ انعام (آیت ۱۴۴۔ اور ۱۴۶) میں بھی لفظ بقرہ اور اسی طرح سورۂ یوسف (آیت ۴۳۔ اور ۴۶) میں بھی لفظ بقرات کی تکرار ہوئی ہے مگر گائے کے متعلق جو تفصیل سورۂ بقرہ میں پائی جاتی ہے وہ ان سوروں میں نہیں ملتی۔
آل عمران	لفظ آل عمران پورے قرآن مجید میں صرف اسی سورے میں دو مرتبہ (آیت ۳۲۔ اور ۳۵) استعمال ہوا ہے۔
نساء	نساء یعنی خواتین اس سورے کی ۱۷ آیتوں میں تفصیلی طور سے عورتوں کے احکام بیان ہوئے ہیں۔
مائدہ	قرآن مجید میں فقط اسی سورے کی آیت نمبر ۱۱۲۔ اور ۱۱۴ میں اس لفظ کی تکرار ہوئی ہے۔

انعام	انعام یعنی چوپائے، جانور۔ دوسرے سوروں سے زیادہ اس سورے میں (۶ آیتوں میں) چوپایوں کا تذکرہ ہوا ہے۔
اعراف	قرآن مجید کے صرف اس سورے کے ۴۶ ویں اور ۴۸ ویں آیت میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔
انفال	فقط اسی سورہ کی پہلی آیت میں دو مرتبہ اس لفظ کی تکرار ہوئی ہے۔
برأت	جتنی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اس سورے میں مشرکین سے برأت یعنی بیزاری اور دوری کا تذکرہ ہے کسی اور سورہ میں نہیں۔
یونس	فقط اسی سورہ میں جناب یونسؑ کے حالات زندگی بیان ہوئے ہیں۔
ہود	حضرت ہودؑ کا تذکرہ اسی سورہ سے مخصوص ہے۔
یوسف	اسی سورے میں آپ کے اسم مبارک کی ۲۵ مرتبہ تکرار ہوئی ہے۔
رعد	رعد یعنی بجلی فقط اسی سورہ کی بارہویں آیت میں تسبیح کرنے کا تذکرہ ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۹ میں فقط لفظ رعد کا استعمال ہوا ہے۔
ابراہیم	شہر مکہ اور اپنی ذریت طاہرہ کے بارے میں آپ کی دعاؤں کا تفصیلی تذکرہ اسی سورہ میں ہے۔
حجر	فقط اسی سورہ میں اصحاب حجر کی داستان بیان ہوئی ہے۔
نحل	فقط اسی سورہ میں نحل (شہد کی مکھی) کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
اسراء	یہ وہ سورہ ہے جس میں اسراء (سفر معراج) آیا ہے جس میں معراج رسولؐ کی طرف اشارہ ہے۔
کہف	اصحاب کہف کا ماجرا فقط اسی سورہ میں بیان ہوا ہے۔
مریم	یہی وہ سورہ ہے جس میں حضرت مریمؑ کا واقعہ "وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ" کہہ کے آیت نمبر ۱۶ تا ۳۵ شرح وبسط کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران میں بعنوان آل عمران آپ کے حالات زندگی کی طرف محض اشارہ ہوا ہے۔

طٰہٰ	اس سورے کا آغاز لفظ طٰہٰ سے ہوا ہے۔
انبیاء	یہ وہ واحد سورہ ہے جس میں (عربوں کے نزدیک) مشہور و معروف انبیاء کرامؑ کا تذکرہ ہوا ہے۔
حج	اس سورے میں آیت نمبر ۲۵ تا ۳۸ تفصیلی طور پر حج کا ذکر ہوا اور "اذّن فی الناس بالحج" کے ذریعہ اعلان حج ہوا۔
مومنون	یہ سورہ جملہ "قد افلح المومنون" سے شروع ہوا۔
نور	آیۂ نور اسی سورہ میں ہے۔
فرقان	اس سورے میں قرآن مجید کو فرقان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔
شعراء	صرف اسی سورہ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔
نمل	نمل یعنی چیونٹی کا تذکرہ فقط اسی میں ہوا ہے۔
قصص	اس سورہ میں "قص علیہ القصص" کی عبارت میں فعل اور مصدر دونوں استعمال ہوئے ہیں، اگرچہ سورۂ یوسف میں بھی "نقص علیک احسن القصص" کی عبارت موجود ہے لیکن اس سورے کا نام یوسف رکھنا متن سورہ سے زیادہ ہم آہنگ تھا۔
عنکبوت	یعنی مکڑی، صرف اسی سورے میں یہ نام لیا گیا ہے۔
روم	روم کا نام صرف اسی میں ہے۔
سجدہ	چونکہ اس میں آیت سجدہ موجود ہے البتہ دوسرے سوروں میں بھی آیات سجدہ پائی جاتی ہیں لیکن ان سوروں کو موجودہ اسماء سے موسوم کرنا مختلف وجوہات کی بنا پر زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔
احزاب	واقعہ (جنگ) احزاب کا تذکرہ اسی سورہ کا امتیاز ہے۔
سبا	لفظ سبا کا استعمال اسی سورہ کی خصوصیت ہے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سوروں کے نام رکھنے میں کوئی نہ کوئی مناسبت ضرور پائی جاتی ہے البتہ نام رکھنے کا عمل مذکورہ اسباب پر ہی موقوف نہیں ہے اس کے لئے ہلکی پھلکی مناسبت بھی کافی ہے۔

بعض سوروں کے متعدد نام

اکثر و بیشتر سوروں کا فقط ایک نام ہے، لیکن کچھ سوروں کے دو تین نام ہیں یا اس سے بھی زیادہ نام ہیں۔ کئی ناموں کے مختلف اور مخصوص اسباب ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ حمد کو لے لیجئے۔ جلال الدین سیوطی نے اس سورہ کے لئے بیس سے زیادہ نام بیان کئے ہیں لیکن حمد کے علاوہ تین دوسرے نام زیادہ مشہور و معروف ہیں ذیل کی سطروں میں وجہ تسمیہ کے ساتھ انہیں ذکر کیا جا رہا ہے۔

(الف) فاتحۃ الکتاب ۔اس جملہ کا لفظی ترجمہ ہے کتاب کھولنے والی، اس کے لئے یہ نام اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ یہ نزول کے اعتبار سے پہلا مکمل سورہ اور قرآن میں لکھے جانے کے اعتبار سے بھی سورۂ اول ہے۔

(ب) ام الکتاب ۔اُم کا مطلب ہے مقصد اور ہدف۔ چونکہ قرآن مجید کے سارے اغراض و مقاصد اس مختصر سورے میں جمع کر دیئے گئے ہیں لہٰذا اسے اُم الکتاب کہا جاتا ہے اور اسے قرآن کا سب سے افضل سورہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

(ج) السبع المثانی۔ سبع کا مطلب سات اور مثانی یعنی قابل تکرار۔ قرآن کے چھوٹے سوروں کو مثانی کہا جاتا ہے۔ چونکہ ان کی تکرار آسان ہے اور سورۂ حمد کو السبع المثانی کہے جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورہ چھوٹا اور سات آیتوں پر مشتمل ہے۔

آئندہ سوروں میں نمونہ کے طور پر کچھ سوروں کے ایک سے زائد اسماء پیش کئے جا رہے ہیں:

توبہ (برائت) نباء (عم) اسراء (سبحان، بنی اسرائیل)

بینہ (لم یکن) نمل (سلیمان) ماعون (دین، ارایت)

غافر (مومن) مسد (تبت) فصلت (سجدہ)

توحید (اخلاص) محمد (قتال) دھر (انسان، ھل اتی)

قمر (اقتربت)　　قریش (ایلاف)

ملک (تبارک) شرح (انشراح)　　معارج (سال، واقع)

قرآنی سوروں کے گروہی نام

۱۔سبع طوال ۔ سات بڑے سوروں یعنی سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، اعراف، انعام، مائدہ اور سورۂ انفال و برائت کہ ان دونوں کو ایک سورہ شمار کیا گیا ہے۔

۲- مئین : وہ سورے کہ جن کی آیتیں سو سے زیادہ ہیں مگر حجم کے لحاظ سے سبع طوال سے مختصر ہیں۔ قرآن مجید میں ایسے بارہ سورے موجود ہیں۔ یونس، ہود، یوسف، نحل، اسراء، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء، مومنون، شعراء اور صافات۔

۳- مثانی : وہ سورے کہ جن کی آیتوں کی تعداد ۱۰۰ سے کم ہے، ان کو چھوٹے اور قابل تکرار ہونے کی وجہ سے مثانی کہا جاتا ہے۔ تقریباً بیس سورے اس گروہ میں آتے ہیں۔

٤- حوامیم : وہ سات سورے جو حٰمٓ سے شروع ہوتے ہیں:۔ مومن، فصلت، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ اور احقاف۔

۵- ممتحنات : یہ گروہ تقریباً بیس سوروں پر مشتمل ہے فتح، حشر، سجدہ، طلاق، قلم، حجرات، تبارک، تغابن، منافقون، جمعہ، صف، جن، نوح، مجادلہ، ممتحنہ اور تحریم۔

٦- مفصلات : ان سوروں کو کہا جاتا ہے جن کی آیتوں کے درمیان کم فاصلہ ہے (آیتیں چھوٹی ہیں) سورۂ رحمٰن سے لے کر قرآن مجید کے آخر تک اسی طرح کے سورے میں (سوائے ان چند سوروں کے جو ممتحنات یا مائین کے گروہ میں آتے ہیں)

قرآن کے سوروں اور آیات کی تعداد

قرآن مجید اسی موجودہ صورت اور ۱۱۴ سوروں کے ساتھ نازل ہوا۔ اس میں نہ کوئی کمی اور

نہ زیادتی ہوئی، صحابہ اور تابعین کی نقل کے مطابق پیغمبرؐ اسلام کے ذریعہ ہم تک پہنچا۔ قرآن کے سوروں کی مذکورہ تعداد متواتر ہے۔ اس سے زیادہ غیر معتبر اور اس سے کم بلا دلیل ہے۔

فواصل آیات (آیتوں کے شروع اور ختم ہونے کے محل) کی تعیین اجتہادی امر نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں کسی کی ذاتی رائے یا تحقیق کارآمد نہیں ہوسکتی۔ معتبر صرف اور صرف قول رسولؐ ہے۔ ایسا نہیں کہ بات پوری ہونے کے ساتھ آیت بھی ختم ہو جاتی ہو۔ (ہم دیکھتے ہیں کہ) بسا اوقات اثنائے گفتگو اور بات مکمل ہونے سے پہلے ہی آیت تمام ہو جاتی ہے اور بعد میں آنے والی آیتیں بات کو مکمل کرتی ہیں پس آیت کا چھوٹا بڑا ہونا یا آغاز و اختتام، اس کے مطالب سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ خالص توقیفی ہیں یعنی صرف تعیین رسولؐ سے قابل فہم ہیں۔

(گذشتہ علماء کے درمیان آیتوں کی تعداد کے بارے میں تھوڑا بہت اختلاف اس لئے پایا جاتا ہے کہ دوران تلاوت آیت ختم ہونے سے پہلے ہی پیغمبرؐ اسلام کبھی کبھی ٹھہر جاتے تھے تو لکھنے والے غلطی سے یہ سمجھ بیٹھتے تھے کہ آیت ختم ہوگئی جبکہ وہ آیت ابھی باقی ہوتی تھی۔)

ابن عباس سے منقول ہے کہ قرآن کی کل آیتیں ۶۶۰۰ اور حروف ۳۲۰۶۷۱ عدد ہیں، کلمات قرآن کے سلسلہ میں اختلاف ہے بعض نے ۷۷۲۷۷، کچھ نے ۷۷۹۳۴ ایک گروہ نے ۷۷۴۳۴ اور ایک دوسرے طبقے نے ۷۷۸۰۷ کلمے شمار کئے ہیں۔

کوفیوں کی روایت کے مطابق (جو سب سے صحیح اور معتبر روایت ہے) مولائے کائنات نے فرمایا کہ آیات قرآن کی تعداد ۶۲۳۶ ہے۔ (الاتقان ص/۱۹۰، ۱۸۹ اور ۱۹۷)

کوفیوں نے ابن ابی لیلیٰ سے اور انہوں نے ابو عبد الرحمٰن سُلمیٰ سے اور انہوں نے امیر المومنینؑ سے یہ روایت نقل کی ہے) آیات قرآن کی موجودہ تعداد یہی مانی جاتی ہے۔ یہ تعداد دو مفروضوں پر مبنی ہے۔

اولاً یہ کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سورہ محمد کے علاوہ کسی اور سورہ میں مستقل آیت تسلیم نہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ سوروں کے شروع میں حروف مقطعات مستقل آیت شمار کئے جائیں۔

سوالات

۱۔قرآن مجید کے کتنے نام بیان کئے گئے ہیں؟ وہ چار نام جو نام کے طور سے قرآن مجید میں آئے ہیں کون کون سے ہیں؟

۲۔آیت اور سوروں کے معنی بیان کیجئے۔قرآن کے اجزاء کے لئے لفظ سورہ اور آیت کا انتخاب کس نے کیا؟

۳۔سوروں کے نام رکھنے اور ان میں موجودہ آیتوں کو رکھنے کا کام کیسے اور کس نے انجام دیا؟

۴۔سورۂ حمد کے دوسرے تین معروف نام مع وجہ تسمیہ بیان کیجئے۔

۵۔مندرجہ ذیل ناموں کا اطلاق کس طرح کے سوروں پر ہوتا ہے:۔

سبع طوال، مئین، مثانی، حوامیم، ممتحنات، مفصلات۔

۶۔امیر المومنینؑ سے منقول آیتوں کی صحیح تعداد کیا ہے؟ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی صورت حال واضح کیجئے۔

۷۔تعداد آیات کے بارے میں گذشتہ علماء کے درمیان جزوی اختلاف کی بنیاد کیا ہے؟

آٹھواں سبق

جمع قرآن

قرآن مجید کی موجودہ شکل زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ مختلف افراد اور گروہوں کے ذریعہ وجود میں آئی، ہر سورے کی آیتوں کی تعداد اور ترتیب و تنظیم حکم رسولؐ سے عمل میں آئی۔سورہ کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتا تھا اور پھر ترتیب نزول کے مطابق اس میں آیات جڑتی رہتی تھیں۔یہاں تک دوبارہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے ذریعہ دوسرا سورہ شروع ہو جاتا تھا۔

عموماً آیتیں اسی طرح ترتیب پائی تھیں، لیکن کبھی کبھی پیغمبرؐ اسلام جبرئیل کے اشارہ پر حکم دے دیتے تھے کہ فلاں آیت معمول اور عام روش کے خلاف کسی دوسرے سورے میں ثبت کی جائے مثلاً آیت "وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ"

"اس دن سے ڈرو جس دن تم سب خدا کی بارگاہ میں پلٹائے جاؤ گے پھر ہر نفس کو اس کے کئے کا پورا پورا صلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا" (بقرہ/۲۸۱)

کہا جاتا ہے کہ یہ پیغمبرؐ پر نازل ہونے والی آخری آیات میں سے ہے، لیکن پیغمبرؐ کے حکم سے یہ سورۂ بقرہ کی آیۂ "ربا" اور آیۂ "دین" کے وسط میں رکھی گئی۔نتیجہ یہ نکلا کہ عام دستور یا غیر معمولی خصوصی روش کے مطابق آیتوں کی ترتیب و تنظیم سے رسولؐ اسلام کے حکم سے اور آپ کی نگرانی میں انجام پائی ہے۔جسے اصطلاحاً توقیفی کہا جاتا تھا۔(یہ بات تو آیتوں کی ترتیب سے متعلق تھی۔

اب ذرا سوروں کی ترتیب کا حال ملاحظہ فرمائیں۔)

سوروں کی ترتیب و تنظیم کے بارے میں ماہرین کے درمیان اختلاف ہے۔

علم الہدیٰ سید مرتضیٰؒ ان کے دوسرے متعدد معاصر محققین کا نظریہ ہے کہ رسولؐ کے زمانے کے قرآن کی ترتیب و تنظیم بھی من وعن موجودہ قرآن جیسی تھی کیونکہ یہ بہت بعید معلوم ہوتا کہ قرآن مجید کی ترتیب و تنظیم جیسے اہم مسئلہ کو رسولؐ نے اپنے بعد کے لئے چھوڑ دیا ہو جبکہ اکثر محققین اور مورخین کا اصرار ہے کہ 'سوروں کی ترتیب اور جمع آوری وفات رسولؐ کے بعد سب سے پہلے حضرت علیؑ اور پھر دوسرے صحابہ کے ذریعہ عمل میں آئی' بہرحال وفات رسولؐ کے بعد صحابہ کے ہاتھوں قرآن کی جمع آوری مسلمات تاریخ میں سے ہے۔

وفات رسولؐ کے بعد سب سے پہلے حضرت علیؑ اس کام میں مشغول ہوئے۔ روایات کے مطابق چھ مہینہ تک خانہ نشین رہ کر اس کام کو منزل تک پہنچایا۔ ابن ندیم کہتے ہیں کہ 'سب سے پہلے جو مصحف مرتب ہوا وہ حضرت علیؑ کا مصحف تھا جو آل جعفر کے پاس رہتا تھا۔' یہی ابن ندیم مزید لکھتے ہیں کہ ابو یعلیٰ حمزہ حسنی کے پاس میں نے حضرت علیؑ کا تحریر کیا ہوا مصحف دیکھا جس کے کچھ صفحات ندارد تھے۔ اور حسن بن علی کی اولاد نے اسے میراث کے طور پر لے رکھا تھا۔ (الفہرست ص/۴۷ اور ۴۸)

محمد ابن سیرین عکرمہ سے ناقل ہیں کہ "آغاز خلافت ابوبکر میں حضرت علیؑ خانہ نشین تھے اور قرآن کے جمع کرنے میں مشغول تھے۔" راوی نے پوچھا کیا مصحف علیؑ کی ترتیب و تنظیم دوسرے مصحفوں جیسی تھی؟ اور کیا اس میں ترتیب نزول کا لحاظ رکھا گیا تھا؟ عکرمہ نے کہا کہ جن وانس مل کر بھی علیؑ کی طرح قرآن جمع نہیں کر سکتے۔ ابن سیرین کہتے ہیں: "میں نے اس مصحف کو حاصل کرنے کی جتنی کوششیں کیں سب ناکام رہیں۔ (طبقات ابن سعد ج/۲ ص/۱۰۱، الاتقان ج/۱ ص/۵۷)

ابن جزی کلبی فرماتے ہیں کہ اگر مصحف علیؑ دستیاب ہو جاتا تو بہر صورت وہ علم کا ذخیرہ اور خزانہ ہوتا۔" (التمہید ج/۲ ص/۲۸۸ اور ۱۹۲ تا ۲۹۶)

مصحف علیؑ کے امتیازات

جو خصوصیات حضرت علیؑ کے مصحف میں تھیں دوسرے مصاحف ان سے محروم تھے:

۱۔ نزول کے مطابق آیتوں اور سوروں کی ترتیب کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس مصحف میں مکی آیتیں مدنی آیتوں سے پہلے تھیں اور نزول آیات کے عین مطابق تاریخ وار ترتیب بالکل واضح تھی۔ اس طرح اسلامی احکام وقوانین اور ناسخ ومنسوخ کے مسئلہ کو طے کرنے میں آسانی ہو جاتی تھی۔

۲۔ اس مصحف میں ساری آیات پیغمبر اسلامؐ کی قرأت کے مطابق لکھی گئی تھیں جس کے بعد قطعی طور پر اختلاف قرأت کا راستہ بند ہو جاتا اور پھر آیت کے مندرجات اور مفہوم کا سمجھنا اور صحیح تفسیر کرنا زیادہ آسان ہوتا (کیونکہ کبھی کبھی اختلاف قرأت کے نتیجہ میں آیت کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں)

۳۔ اس مصحف کے حاشیہ پر آیتوں اور سوروں کی شان نزول کی وضاحت کر دی گئی تھی۔ یہ حاشئے آیتوں کے معانی ومطالب کے سمجھنے اور پیچیدگیوں کو ختم کرنے کا بہترین وسیلہ تھے۔ ان حاشیوں میں اسباب نزول کے علاوہ آیتوں کی تاویل بھی موجود تھی، خود امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"میں نے مسلمانوں کے لئے وہ قرآن پیش کیا جو تنزیل وتاویل دونوں پر مشتمل تھا۔"

(آلاء الرحمان ج/۱ ص/۲۵۷)

آپؑ کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ ہو: "رسولؐ اکرم پر کوئی بھی آیت نازل نہیں ہوئی مگر یہ کہ آپؐ نے میرے لئے اس کی تلاوت کی۔ املا فرمایا۔ اور میں نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا۔ اسی طرح رسولؐ اللہ نے مجھے ہر آیت کی تفسیر وتاویل، ناسخ ومنسوخ اور محکم ومتشابہ کی تعلیم فرمائی اور ان چیزوں کے سمجھنے اور یاد رکھنے کے لئے میرے حق میں خدا سے دعا کی اور اس وقت سے لے کر اب تک نہ کوئی آیت فراموش ہوئی اور نہ ہی آپ سے ملنے والے علم وعرفان میں کوئی کمی ہوئی۔"

(تفسیر برہان ج/۱ ص/۱۶ حدیث/۱۴)

اگر رسولؐ خدا کی رحلت کے بعد اس مصحف سے جو کہ آیات قرآن کی تفسیری اور توضیحی نکات پر مشتمل تھا استفادہ کیا جاتا تو آج قرآن فہمی کی راہ میں اس قدر مشکلات درپیش نہ ہوتیں۔

مصحف علیؑ (کا انجام)

مولائے کائنات کے خاص الخاص صحابی سلیم بن قیس ہلالی (متوفی ۹۰ھ) حضرت سلمان فارسی سے روایت کرتے ہیں کہ "جس وقت حضرت علیؑ نے اپنی طرف سے لوگوں کی بے توجہی کا احساس کیا تو خانہ نشین ہوگئے، اور قرآن جمع کرنے میں مصروف ہوگئے یہاں تک کہ اسے مکمل کرلیا۔ قرآن مجید حضرت علیؑ کے جمع کرنے سے پہلے پراگندہ طور پر کاغذ کے ٹکڑوں، باریک تختیوں اور اوراق کے اوپر لکھا ہوا تھا۔ مشہور مورخ یعقوبی کی روایت کے مطابق حضرت علیؑ قرآن جمع کرنے کے بعد یہ سب لکھا سامان کو ایک ایک اونٹ کی پشت پر بار کر کے مسجد میں لے آئے، لوگ حضرت ابوبکر کے گرد و پیش جمع تھے۔ حضرت نے لوگوں سے کہا کہ وفات رسولؐ کے بعد سے اب تک میں قرآن جمع کرنے میں مشغول تھا، پیغمبرؐ پر جو کچھ نازل ہوا تھا اس صحیفہ میں یکجا کر دیا ہے تا کہ کل یہ نہ کہو کہ ہم اس سے غافل رہ گئے، قرآن کی ایسی کوئی آیت نہیں جس کی تلاوت اور تفسیر و تاویل سے رسولؐ اللہ نے مجھے آگاہ نہ کیا ہو۔

آپ یہ فرما ہی رہے تھے کہ اچانک اس گروہ کا ایک سربراہ اٹھا اور جو کچھ حضرت علیؑ لائے تھے اسے (حقارت سے) دیکھنے کے بعد آپ سے کہا: "ہمیں تمہارے لائے ہوئے قرآن کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہی کافی ہے۔" حضرت علیؑ نے فرمایا: "اگر ایسا ہے تو پھر کبھی اسے نہ دیکھ سکو گے۔" آپ یہ کہہ کے اپنے بیت الشرف چلے گئے اور اس کے بعد وہ قرآن کسی نے نہیں دیکھا۔" (السقیفہ، ص/۸۲)

حضرت عثمان کے دور حکومت میں جب مصاحف صحابہ کے حامیوں کے بیچ شدید اختلاف ہوا تو طلحہ بن عبداللہ نے امیرالمومنین حضرت علیؑ سے عرض کی کہ کیا آپ کو وہ دن یاد ہے جب آپ کا

پیش کیا ہوا قرآن رد کر دیا گیا تھا وہی قرآن آپ اس وقت پیش کر دیتے، تو کتنا اچھا ہوتا، یہ شدید اختلاف بھی دور ہو جاتا۔ حضرت علیؑ خاموش رہے۔ طلحہ نے اپنا سوال دہرایا تو آپ نے فرمایا کہ دراصل میں عمداً جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ پھر آپ نے طلحہ سے پوچھا کہ آج جو قرآن لوگوں کے پاس ہے کیا یہ وہی قرآن ہے جو رسولؐ خدا پر نازل ہوا تھا یا اس میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے؟ طلحہ نے کہا کہ یقیناً یہ وہی قرآن ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ جب ایسا ہے تو اسی کو اختیار کرو اور اسی پر عمل کرو نجات پا جاؤ گے۔ طلحہ نے کہا کہ بس یہی ہمارے لئے کافی ہے اور پھر خاموش ہو گئے۔ (السقیفہ/۱۲۴)

حضرت امیرؑ نے اس کے جواب کے ذریعہ اتحاد و یکجہتی کی اہمیت کے ساتھ ساتھ قرآن کی حقانیت اور اصلی حالت پر اس کا باقی رہنا بھی ثابت کر دیا۔

زید ابن ثابت اور جمع قرآن

پیغمبرؐ اسلام نے جمع قرآن کی وصیت فرمائی تا کہ یہودیوں کی آسمانی کتاب توریت کی طرح اس کی تحریف اور بربادی کا اندیشہ نہ رہ جائے۔ (تفسیر قمی، ص/۷۴۵)

حضرت علیؑ نے اس وصیت پر عمل کیا۔ مگر بعض اغراض و مقاصد کی بنا پر آپ کا قرآن قبول نہیں کیا گیا۔ مگر چونکہ قرآن مجید اسلامی سماج کی بنیاد اور قوانین اسلامی کی اصل و بنیاد تھا لہٰذا خلفاء وقت کے لئے لکڑی اور ہڈی کے ٹکڑوں پر بکھرا ہوا اور حفاظ کے سینوں میں موجود قرآن کریم کو یکجا کرنے کے لئے دوسرے کاتبین وحی کا سہارا لینا ضروری تھا، خصوصاً جنگ یمامہ میں ۷۰ اور ایک قول کے مطابق ۴۰۰ حافظین قرآن کی شہادت کے بعد جو درحقیقت مسلمانوں کے لئے خطرے کی گھنٹی تھی یہ ضرورت اور بھی زیادہ شدید ہو گئی۔

لہٰذا ابوبکر نے زید بن ثابت سے قرآن جمع کرنے کا تقاضا کیا۔ زید ابن ثابت بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر نے مجھے بلایا اور وہاں موجود عمر ابن خطاب سے مشورہ کے بعد کہا کہ جنگ یمامہ میں بہت سے قارئین قرآن اور حافظین قرآن قتل ہو گئے ہیں اور اس بات کا خطرہ ہے کہ جنگ یمامہ

جیسے دیگر مواقع پر دوسرے حفاظ قرآن بھی قتل ہو جائیں جس کے نتیجہ میں قرآن کریم ضائع ہو جائے۔ اس کے بعد مجھ سے جمع قرآن کا تقاضہ کیا۔ میں نے کہا: ''تم وہ کام کیوں کرنا چاہتے ہو جسے رسولؐ اسلام نے انجام نہیں دیا۔'' ان دونوں نے کہا یہ کام بہت ضروری ہے ہر حال میں انجام پانا چاہئے اور پھر مجھ سے اتنا اصرار کیا کہ مجھے ان کی بات قبول کرنی پڑی۔ پھر ابوبکر نے مجھ سے کہا کہ میری نظر میں تم ایک جوان عقلمند ہو اور تمہارے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ تم رسولؐ کے کاتب وحی تھے یہ عہدہ سنبھالو اور بخوبی اسے انجام دو۔ زید کہتے ہیں کہ اگر چہ مجھے سونپی جانے والی اس ذمہ داری کی سنگینی برداشت کرنا میرے لئے کوہ گراں سے سخت ہے، لیکن مجبور ہو کر قبول کر لیا اور قرآن مجید جو پتھر اور لکڑی کے صفحات پر لکھا ہوا تھا اس کو جمع کر دیا۔

(صحیح بخاری ج/۶ ص/۲۲۵، مصاحف سجستانی ص/۶، البرہان ج/۱ ص/۲۳۳)

جمع قرآن میں زید کا طریقۂ کار

زید نے صحابہ کی ایک جماعت کی مدد سے یہ کام انجام دیا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم اٹھاتے ہوئے اعلان عام کر دیا: ''جس کے پاس جتنا قرآن ہے وہ لے آئے۔''

یعقوبی کہتا ہے کہ زید نے اپنی سربراہی میں ۲۵ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی کے افراد ہر روز مسجد میں بیٹھتے تھے اور لوگ اپنے پاس موجود سورہ یا آیت ان کے حوالہ کر دیتے۔ یہ کمیٹی دو گواہوں کی گواہی سے پہلے قرآن کے نام پر کوئی بھی چیز قبول نہیں کرتی تھی۔ پہلا گواہ خطی نسخہ ہوتا تھا یعنی بعنوان قرآن پیش کی جانے والی چیز کے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی چیز پر لکھی ہوتی ہو اور دوسرا گواہ لوگوں کی تائید ہوتی تھی کہ انھوں نے یہ چیز پیغمبرؐ کی زبان سے سنی ہے۔

اس طرح زید نے قرآن کریم کے سوروں اور آیتوں کو یکجا کر کے انہیں بکھرنے اور بربادی کے خطرے سے بچا لیا۔ ہر سورہ مکمل ہو جانے کے بعد ایک چمڑے کے بنے ہوئے ''دیعہ'' نامی صندوق میں رکھ دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے سارے سورے مکمل ہو گئے۔ البتہ زید نے

سوروں کی ترتیب و تنظیم کا کام نہیں کیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج/۱ ص/۲۶۱، البرہان ج/۲ ص/۳۵، الاتقان ج/۱ ص/۵۸، فتح الباری ج/۹ ص/۱۶، مناہل العرفان ج/۱ ص/۲۵۴، فجر الاسلام ص/۱۹۵)

یہ صحیفے کہ جن پر قرآنی سورے تحریر تھے تکمیل کے بعد ابوبکر کے سپرد کر دیئے گئے۔ ابوبکر کے بعد حضرت عمر کو منتقل ہو گئے اور عمر کے بعد ان کی بیٹی حفصہ ان صحیفوں کی ذمہ دار ہو گئیں۔ مصاحف کو یکساں کرتے وقت دوسرے نسخوں کو اس سے ملانے کے لئے عثمان نے بطور عاریت اسے منگوایا اور پھر حفصہ کے پاس بھجوا دیا۔ حفصہ کی موت کے بعد معاویہ کی طرف سے والیٔ مدینہ مروان نے ان کے وارثوں سے لے کر اسے نیست و نابود کر دیا۔ (ارشاد الساری فی شرح البخاری، ج/۷ ص/۴۴۹، التمہید ج/۱ ص/۳۰۰)

صحابہ کے مصاحف

پیغمبرؐ اسلام کی رحلت اور مصحف علیؑ رد کئے جانے کے بعد زید کے علاوہ کچھ دوسرے صحابہ نے بھی قرآن مجید کو جمع کیا جن میں سے کچھ کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

عبداللہ بن مسعود، اُبی ابن کعب، مقداد بن اسود، سالم ابی حذیفہ کے علاوہ معاذ بن جبل اور ابوموسیٰ اشعری۔ کہا جاتا ہے کہ قرآنی سوروں کو سب سے پہلے حذیفہ کے غلام سالمہ نے مرتب کیا۔ قرآن کی جمع آوری کے بعد سالم اور ان کے رفقاء کار اس مجموعہ کا نام طے کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے۔ ان میں سے کسی نے کہا کہ اس کا نام ''سفر'' رکھ دیا جائے۔ مگر یہ نام کسی نے پسند نہیں کیا کیونکہ یہ یہودیوں کی کتاب کا نام تھا۔ سالم نے ''مصحف'' کی پیش کش کی اور کہا کہ میں نے اسی طرح کی (متعدد صحیفوں پر مشتمل) کتاب حبشہ میں دیکھی جسے لوگ ''مصحف'' کہتے تھے۔ سارے حاضرین نے یہ رائے پسند کی اور جمع کئے ہوئے صحیفوں کے لئے ''مصحف'' کا نام قبول کر لیا۔ واضح رہے کہ قرآن ما یقرا یعنی پڑھی جانے والی چیز کا نام ہے۔ اور جب اس قرآن نے صحیفوں پر مشتمل کتاب کی شکل اختیار کر لی تو اسے مصحف کہا جانے لگا۔

سوالات

۱۔ترتیب آیات کے توقیفی ہونے کا کیا مطلب ہے؟

۲۔مشہور نظریہ کے مطابق سوروں کے درمیان نظم وترتیب سب سے پہلے کس نے کی؟

۳۔حضرت علیؑ کے مصحف کے امتیازات کیا تھے؟

۴۔خلیفہ اول کے زمانے میں کس وجہ سے قرآن کی جمع آوری ہوئی؟

۵۔قرآن مجید کے جمع کرنے میں زید کا طریقۂ کار کیا تھا؟ بالآخر اس مصحف کا کیا انجام ہوا؟

۶۔امیر المومنینؑ کے علاوہ دوسرے کن لوگوں نے قرآن جمع کرنے کے سلسلہ میں اقدام کیا؟

۷۔قرآن کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے بتایئے کہ اسے مصحف کب سے کہا جاتا ہے؟

نواں سبق

اختلاف مصاحف

گذشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ وفات پیغمبرؐ کے بعد کا زمانہ جمع قرآن کا دور کہا جاتا ہے۔ اکابر صحابہ اپنے علم اور استعداد کے مطابق آیات کو جمع کرنے اور سوروں کی ترتیب وتنظیم میں لگ گئے۔ اور اس طرح ہر ایک نے اپنا الگ مصحف بنالیا۔ بعض صحابہ جو اس کام کی لیاقت نہیں رکھتے تھے دوسروں کے نسخے لے لیتے تھے۔ اسلامی حکومت کی وسعت اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے مزید نسخوں کی ضرورت بھی بڑھتی جارہی تھی۔ اس وجہ سے مصاحف کی تعداد بہت تیزی سے بڑھنے لگی۔

ہر مصحف کی اہمیت اور مقبولیت اس کے جمع کرنے والے صحابہ کی بزرگی اور مرتبے سے جڑی تھی۔ مثلاً رسولؐ کے نامی گرامی صحابی عبداللہ بن مسعود کا مصحف اہل کوفہ کے نزدیک مرجع شمار ہوتا تھا۔ اسی طرح مدینہ میں ابی ابن کعب، بصرہ میں ابوموسیٰ اشعری اور دمشق میں مقداد بن اسود کے مصحف مقبول خاص وعام تھے۔

اختلاف کا سبب

چونکہ متعدد لوگوں نے علاحدہ طور پر مصحف جمع کئے اور یہ اس کام میں یکساں ماہرانہ صلاحیت نہ رکھتے تھے، لہٰذا ہر مصحف، روش، ترتیب، قرأت وغیرہ میں دوسرے مصحف سے مختلف تھا۔ پھر یہی اختلاف لوگوں کے درمیان اختلاف کا سبب بن گیا۔

بسا اوقات دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے مسلمان جب جنگی مہم یا کسی دوسرے موقع پر اکٹھا ہوتے تھے، تو اپنے اپنے مصحف کے سلسلہ میں پائے جانے والے تعصب کی بنا پر آپسی اختلاف وانتشار کا شکار ہو جاتے تھے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

سرزمین ارمنستان کی جنگی مہم سے واپسی کے بعد حذیفہ نے سعید ابن عاص سے کہا: ''میں نے اس سفر میں جس چیز کا مشاہدہ کیا اگر اس پر خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی تو قرآن کے بارے میں لوگوں کے درمیان اس اختلاف کا پیدا ہونا یقینی ہے جو کبھی بھی دور نہ ہو سکے گا۔ سعید نے اس خطرے کے بارے میں تفتیش کی، تو حذیفہ نے کہا کہ میں حمص کے لوگ جنہوں نے مقداد سے قرآن سیکھا ہے وہ اپنی قرأت کو دوسروں کی قرأت سے بہتر تصور کرتے ہیں اور میں نے دمشق کے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ ان کی قرأت دوسروں کی قرأت سے بہتر ہے۔ اہل کوفہ کو دیکھا وہ ابن مسعود کی قرأت کو فوقیت دینے پر تلے ہوئے ہیں اور اسی طرح بصرہ کے لوگ ابوموسیٰ اشعری کی قرأت کو ورد زبان بنائے ہوئے اسے لباب القلوب کے نام سے مشہور کئے ہوئے ہیں۔''

کوفہ پہنچنے کے بعد یہ بات لوگوں کے سامنے پیش کر کے اس کے خطرناک انجام سے آگاہ کیا۔ بہت سے اصحاب اور تابعین نے ان کی تائید کی لیکن ابن مسعود کے طرفدار نے انہیں تنقید کا نشانہ بنایا (اور کہا) کہ ہماری قرأت عبداللہ ابن مسعود کی قرأت کے مطابق ہے لہٰذا ہم پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

حذیفہ اور ان کے حامیوں نے غضبناک ہو کر ان سے کہا: ''خاموش ہو جاؤ، تم غلطی پر ہو۔'' حذیفہ نے کہا: ''خدا کی قسم اگر زندہ رہا، تو یہ بات خلیفۃ المسلمین (عثمان) تک پہنچاؤں گا تا کہ اس کے بارے میں غور وتدبیر کریں (اس مسئلہ کا حل تلاش کریں)۔''

پھر حذیفہ نے ابن مسعود سے سارا ماجرا بیان کیا، تو ابن مسعود نے بھی سخت لہجہ میں جواب دیا۔ سعید ابن عاص غصہ ہو کر وہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں اور وہاں موجود لوگ بھی اِدھر اُدھر ہو جاتے

ہیں۔ اور شدید غصے کی حالت میں حذیفہ عثمان سے ملاقات کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔

(الکامل فی التاریخ ج/۳ ص/۱۱۱)

یزید نخعی کہتے ہیں کہ جس زمانے میں ولید ابن عقبہ عثمان کی طرف سے مدینہ کا گورنر تھا میں مسجد کوفہ گیا ہوا تھا، وہاں قرأت کے مسئلہ میں ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ ابن مسعود کے حامیوں کے درمیان سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۹۶ کے بارے میں شدید اختلاف ہو گیا تھا۔ ایک گروہ کہہ رہا تھا:

''وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلْبَيْتِ'' ہے اور دوسرا گروہ اصرار کر رہا تھا۔

''وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ہے۔

موقع پر موجود حذیفہ سخت برہم ہو گئے اور انھوں نے کہا: ''پہلے بھی میں نے تمہارے درمیان اس طرح کے جھگڑے دیکھے ہیں اور عثمان کو حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔''

ابن اشتہ انس ابن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ عثمان کے زمانے میں اہل کوفہ کے درمیان قرأت قرآن میں اختلاف پایا جاتا تھا، ایک معلم قرآن کی تعلیم کسی مصحف کے مطابق دیتا تھا تو دوسرا کسی اور کے مطابق۔ نتیجۃً طلاب کے درمیان اختلاف ہو جاتا تھا۔ اور بات معلمین تک پہنچتی تھی، تو وہ ایک دوسرے کی قرأت کو غلط قرار دیتے تھے۔ اس بات سے آگاہ ہونے کے بعد عثمان نے کہا کہ جب یہاں قرأت قرآن میں اختلاف اور غلطیاں پائی جاتی ہیں تو دور دراز کے علاقوں کا کیا حشر ہوگا؟ وہاں کے لوگ تو اور بھی زیادہ اختلافات اور غلطیوں کا شکار ہوں گے۔''

اگر اختلاف قرأت سے متعلق اس طرح کے واقعات سے حذیفہ یمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے دور اندیش افراد لوگوں کو آگاہ نہ کرتے تو یقیناً بہت بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا اور نہایت خطرناک حالات رونما ہوتے۔

انہی خطروں کے پیش نظر دور اندیش صحابہ اور عثمان کو اتحاد مصاحف کی فکر لاحق ہوئی البتہ اس زمانے میں یہ ایک بہت بڑا اور سخت کام تھا۔ پہلے کی حکومت میں انجام نہ پانے کی وجہ سے اس کام کی

اجنبیت اور مختلف شہروں میں رائج ہر مصحف کا کسی نہ کسی نامی گرامی صحابہ کی طرف منسوب ہونا اتحاد مصاحف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے کیونکہ اس بات کا خدشہ بہر حال تھا کہ ائمۂ قرأت اپنے طرفداروں کو لے کر اپنے اپنے مصحف کی حمایت پر تل جائیں اور اتحاد مصاحف کی راہ میں رخنہ اندازی پیدا کریں۔ لہٰذا عثمان نے سب سے پہلے مدینہ میں موجود صحابہ کو اکٹھا کر کے اس سلسلہ میں ان سے مشورہ کیا، تو سب اس کام کی اہمیت وضرورت پر متفق اور حذیفہ یمانی کے ہم خیال نظر آئے۔

(الکامل فی التاریخ ج/۳ ص/۱۱۱)

حضرت علیؑ بھی اس منصوبہ سے موافق تھے۔ ابن داؤد، سوید ابن غفلہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: ''قسم بخدا، عثمان نے ہمارے مشورے کے بغیر مصاحف کے حوالے سے کوئی کام انجام نہیں دیا۔''

قرأتوں کے بارے میں ہم سے مشورہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ کچھ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے ہیں کہ ہماری قرأت تم سے اچھی ہے جبکہ اس قسم کی باتیں کفر کے قریب ہیں۔ میں نے عثمان سے پوچھا کہ تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ جواب میں کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کے پاس صرف ایک طرح کا مصحف ہو اور اس سلسلہ میں بالکل تفرقہ نہ رہے۔'' میں نے کہا کہ تمہارا ارادہ نیک ہے۔ (الاتقان ج/۱ ص/۵۹)

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت علیؑ نے فرمایا کہ:

''اگر مصاحف کا معاملہ میرے حوالہ کر دیا جاتا، تو میں بھی وہی کرتا جو عثمان نے کیا ہے۔''

(النشر فی القراءات العشر ج/۱ ص/۸)

سوالات

۱۔ کوفہ، مدینہ، بصرہ اور شام میں کن کن صحابہ کے مصحف رائج تھے؟

۲۔ مصاحف صحابہ کے درمیان اختلاف کا کیا سبب تھا اور یہ اختلاف کن باتوں میں تھا؟

۳۔ اختلاف مصاحف کے منفی نکات بیان کیجئے۔

۴۔ عثمان کو اتحاد مصاحف کی فکر کیسے لاحق ہوئی؟

۵۔ مذکورہ اتحاد مصاحف کے بارے میں حضرت علیؑ کا کیا نظریہ تھا؟

دسواں سبق

اتحاد مصاحف

اتحاد مصاحف کمیٹی

صحابہ سے مشورہ کرنے کے بعد جلد ہی حضرت عثمان نے اتحاد مصاحف یعنی مصحفوں کو ایک کرنے کے لئے اقدام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو عام خطاب کے ذریعہ اصحاب رسول کو اس کار عظیم میں تعاون کی دعوت دی۔ (الاتقان ج/۱،ص/۵۹،مصاحف بجستانی ص/۲۱)

اور پھر آپ نے ان چار افراد کو اس کام کے لئے منتخب کیا:۔

زید بن ثابت انصاری، سعید بن عاص، عبداللہ ابن زبیر اور عبدالرحمن ابن حارث۔

زید کے علاوہ بقیہ سب قریش کے تھے۔ زید کی قیادت میں یہ چار افراد مصاحف کمیٹی کے بنیادی اراکین شمار ہوتے ہیں۔ (صحیح بخاری ج/۶ ص/۲۲۶)

ان چار افراد کی سربراہی بذات خود عثمان نے سنبھالی۔ عثمان نے سوچا تھا کہ اتحاد مصاحف ایک آسان کام ہے، لہٰذا ایک ایسے گروہ کو اس کام کا ذمہ دار بنا دیا جو اس کام کو انجام دینے کی بھرپور صلاحیت نہیں رکھتا تھا اور آخر کار یہ ذمہ داری سنبھالی۔ چونکہ اتنے اہم کام کو انجام دینے کے لئے ماہر اور تجربہ کار افراد کی ضرورت تھی، اس لئے بالآخر عثمان کو ایسے گروہ کا سہارا لینا پڑا جس میں سید القراء ابی ابن کعب جیسے برجستہ اور شائستہ افراد شامل ہوں۔ (تہذیب التہذیب ج/۲ص/۱۸۷)

ابی ابن کعب کی سربراہی میں تشکیل پانے والی یہ کمیٹی بارہ افراد پر مشتمل تھی:۔

مالک بن ابی عامر، کثیر بن افلح، انس بن مالک، عبداللہ ابن عباس، مصعب ابن سعد، عبداللہ ابن فطیمہ اس کے ممبروں میں تھے۔

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ابی بن کعب کے مصحف سے قرآن جمع کیا ابی ابن کعب بولتے تھے اور دوسرے لکھتے تھے۔ (مصاحف بجستانی ص/۳۰)

اس کام کے مراحل

اتحاد مصاحف کمیٹی نے تین مرحلوں میں اس کام کو انجام دیا:۔

الف) صحیفہ منابع اور مآخذ کو جمع کرنا اور ان سے مطابقت کر کے ایک مصحف مرتب کرنا۔

ب) اس نئے مصحف سے نقل کرنا اور غلطی اور اختلاف سے بچنے کے لئے ان نسخوں کو اصل سے ملانا۔

ج) بلاد اسلامی میں رائج دوسرے مصحفوں اور صحیفوں کو جمع کر کے انہیں نیست و نابود کرنا۔

د) جدید مصحف کی نشر و اشاعت کرنا اور مسلمانوں کے لئے دوسرے مصاحف کی تلاوت اور قرأت سے دستبردار ہو کے جدید مصحف کی تلاوت کو لازم قرار دینا۔

پہلے مرحلے میں عثمان نے لوگوں سے درخواست کی کہ جس قدر بھی انھوں نے پیغمبر اسلام سے سن کر قرآن محفوظ کر رکھا اسے کمیٹی کے حوالے کر دیں۔ تختیوں، ہڈیوں اور لکڑیوں پر لکھے ہوئے قرآن لوگوں نے لا لا کر کمیٹی کے حوالہ کر دیا۔ اسی طرح عثمان نے وہ قرآن بھی طلب کیا جو ابوبکر کے زمانہ میں صحیفوں کی شکل میں مرتب ہوا تھا اور حفصہ کے پاس تھا۔ پہلے تو حفصہ نے وہ قرآن دینے سے انکار کر دیا (شاید بربادی کے خوف سے) لیکن عثمان نے جب واپس کر دینے کا وعدہ کر لیا تو حفصہ نے وہ سارے صحیفے حکومت کے سپرد کر دیئے جو اس کام کے لئے معتبر سند قرار پائے۔

(مصاحف بجستانی ص/۹، صحیح بخاری ج/۶ ص/۲۲۶)

ایک ہی مصحف کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں انس ابن مالک کہتے ہیں: ''میں بولتا تھا اور لوگ آیتیں لکھتے تھے۔'' کسی آیت کے سلسلہ میں اختلاف کی صورت میں ایسے لوگوں کی رائے لی جاتی

انھوں نے سیدھے اسے رسول مقبول سے سنا ہو۔ اگر وہ مدینہ سے دور ہوتے تھے تو اس آیت کے پہلے اور بعد کی آیتیں لکھ کر ان کے پاس بھیج دی جاتی تھیں تا کہ وہ اختلافی آیت صحیح صحیح لکھ دیں یا خود مدینہ چلے آئیں۔ (مصاحف بجستانی ص/۲۱)

اسی طرح اختلافی آیات کی تصحیح کے لئے ابی ابن کعب کے پاس بھیجی جاتی تھی۔

ابن سیرین کہتے ہیں: ''کسی آیت کے سلسلہ میں اختلاف کی صورت میں اسے بعد کے لئے چھوڑ دیتے تھے اور بعض لوگوں کے بقول اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے نسخے مل جائیں جو پیغمبر اسلام کے ذریعہ آخری مرتبہ بعض نسخوں کی تائید کے موقع پر موجود تھے۔'' (مصاحف بجستانی ص/۲۵)

عبداللہ بن ہانی بربری (عثمان کا غلام) ناقل ہے کہ میں عثمان کے ساتھ وہ منظر دیکھ رہا تھا کہ لوگ مصحفوں کے مختلف نسخوں کو ایک دوسرے سے ملا رہے ہیں۔ عثمان نے بکری کی ایک ہڈی میرے حوالہ کی جس پر یہ کلمات لکھے ہوئے تھے "لَمْ یَتَسَنَّ" "لَا تَبْدِیْلَ لِلْخَلْقِ اللّٰہِ" اور "فَمَهِّلِ الْکٰفِرِیْنَ" میں اسے ابی ابن کعب کے پاس لے گیا تو انھوں نے اس کی یوں تصحیح فرمائی "لَمْ یَتَسَنَّہ" (بقرہ/۲۵۹) "لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ" (روم/۳۰) اور "فَمَهِّلِ الْکَافِرِیْنَ" (طارق/۱۷)

(دیکھئے الاتقان ج/۱، ص/۱۸۳)

دوسرے مرحلے میں یعنی نئے مصحف کے نسخوں کو ایک دوسرے سے مطابقت کرنے میں بے توجہی اور سہل پسندی ہوتی گئی۔ جس کے نتیجہ میں عثمانی مصحفوں میں کتابت کی غلطیوں کی بھرمار تھی۔ ابن ابی داؤد سے منقول ہے کہ جب مصحف عثمانی کے نسخے مرتب ہو چکے تو نمونہ کے طور پر ایک نسخہ عثمان کے سامنے پیش کیا گیا، عثمان نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ اگر املا کرنے والا قبیلہ ''ہذیل'' کا اور لکھنے والا قبیلہ ''ثقیف'' کا ہوتا تو کتابت کی غلطیاں سرزد نہ ہوتیں، لیکن ان اغلاط کے باوجود بھی مادری زبان ہونے کے ناطے عرب اس کی صحیح تلاوت کر لیں گے۔ (الاتقان، ص/۳۳، ۳۲)

تیسرے مرحلے میں دوسرے مصحفوں کو جمع کرنے اور ان کو تلف کرنے کے سلسلے میں

عثمان کا طریقہ کار یہ تھا کہ اپنے نمائندے بھیج کر مختلف شہروں سے مصاحف اور صحیفہ اکٹھا کر کے انھیں نذر آتش کرا دیا۔ (صحیح بخاری ج/۶، ص/۲۲۶)

یعقوبی کے بقول عثمان نے سبھی بلاد اسلامیہ سے مصحفوں کو جمع کرا کے پانی اور سرکے کے محلول میں گھول کے صاف کر دیا اور بعض کے بقول سارے مصحف جلا دیئے۔ صرف مصحف عبداللہ ابن مسعود باقی رہ گیا کیونکہ انھوں نے والی کوفہ عبداللہ ابن عامر کو اپنا مصحف دینے سے انکار کر دیا تھا۔

(تاریخ یعقوبی ج/۲، ص/۱۶۰، ۱۵۹)

مصاحف عثمانی کے نسخوں کی تعداد

مورخین کے درمیان بلاد اسلامیہ میں بھیجی جانے والے جدید مصحف کے نسخوں کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابن ابی داؤد کے بقول وہ چھ عدد تھے جو مندرجہ ذیل اہم ترین اسلامی مراکز میں بھیجے گئے: مکہ، کوفہ، بصرہ، شام، بحرین اور یمن۔ ان چھ نسخوں کے علاوہ ایک نسخہ مدینہ میں محفوظ رکھا گیا جسے ''اُم'' یا ''امام'' کہا جاتا تھا۔ (سابق ص/۳۴)

یعقوبی نے ان نسخوں کی تعداد میں دو کا مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ان میں ایک مصر اور دوسرا الجزیرہ بھیجا گیا۔ (تاریخ یعقوبی ج/۲، ص/۱۶۰)

ہر علاقہ میں بھیجا جانے والا مصحف اس علاقہ کی مرکزی جگہ پر محفوظ رہتا تھا اور عام پبلک کی دسترس اور استفادہ کے لئے اس سے نقل کر لی جاتی تھی۔ لوگوں کے لئے قانونی طور پر صرف اس مصحف کی قرأت جائز ہوتی تھی۔ اس سے ہٹ کر دوسری ساری قرأتیں غیر قانونی اور ممنوع تھیں اور ایسا کرنے والا سزا کا مستحق قرار پاتا تھا۔ مدینہ میں موجود مصحف کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ دیگر بلاد اسلامی میں بھیجے گئے نسخوں میں اختلاف کی صورت میں تصحیح کے لئے اسی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عثمان نے ہر مصحف کے ساتھ اس علاقہ میں ایک قاریٔ قرآن بھی روانہ کر دیا تھا تا کہ اسی مصحف کے مطابق لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے۔ منجملہ عبداللہ ابن سائب مکہ کے لئے مغیرہ

ابن شہاب شام کے لئے، ابوعبدالرحمن سلمی کوفہ کے لئے، عامر بن عبدالقیس بصرہ کے لئے مصاحف کے ساتھ روانہ کئے گئے اور خلیفۂ وقت کی طرف سے زید ابن ثابت کو قاریٔ مدینہ (یعنی چیف قاری) کا عہدہ دیا گیا۔ (مناہل العرفان ج/۱ص/۳۹۷،۳۹۶)

مصحف عثمانی کی خصوصیات

۱- ترتیب : مصحف عثمانی میں سوروں کی ترتیب رائج قرآن کے سوروں کی ترتیب سے مکمل طور سے ہم آہنگ تھی۔ بعض مقامات کے علاوہ یہ ترتیب عام طور سے صحابہ کے مصحفوں خصوصاً ابی ابن کعب کے مصحف سے مطابقت رکھتی تھی۔

۲- نقطہ اور علامت : اس زمانہ میں عربوں میں رائج فن کتابت اور اسلوب نگارش کی طرح مصحف عثمانی بھی نقطہ دار اور بے نقطہ حروف کی تمیز کے لئے کسی طرح کی نشانی اور علامت سے خالی تھا لہٰذا اس مصحف میں 'ب' (با) 'ت' (تا) 'ث' (ثا) کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا اور اسی طرح 'ج' (جیم) 'ح' (حا) 'خ' (خا) کے درمیان بھی کوئی تمیز نہیں تھی۔ فتحہ (زبر)، کسرہ (زیر)، ضمہ (پیش) اور تنوین کے ذریعہ حرفوں کے حرکات وسکنات کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی۔ یہ ذمہ داری خود قاریٔ قرآن کی ہوتی تھی کہ سیاق وسباق کو مدنظر رکھ کے کلمات کے وزن اور اعراب کو ایک دوسرے سے تمیز کر کے ان کی صحیح تلاوت کرے۔ اسی وجہ سے شروع شروع میں براہ راست، کسی سے اس کے یا کسی کے نقل پر اعتماد کر کے ہی قرآن کی تلاوت کی جاسکتی تھی۔

بہر حال مصاحف کا علامتوں اور نشانیوں سے خالی ہونا ہی بعد کے زمانوں میں اختلاف قرأت کا بنیادی سبب رہا ہے کیونکہ لوگ سماعت اور حفظ ہی پر اعتماد کرتے تھے اور نتیجے میں ان چیزوں میں خطا ونسیان کا امکان بہر حال پایا جاتا ہے۔ اس سے قطع نظر غیر عرب قوموں کے جزیرۃ العرب میں داخلہ اور اسلامی کے سلطنت میں وسعت کے ساتھ ان کی تعداد اور آبادی میں اضافہ بھی اختلاف

قرأت کا سبب قرار پایا۔

۳- کتابت کی غلطیاں : عثمانی رسم الخط میں عام رسم الخط سے کہیں زیادہ املے کی غلطیاں پائی جاتی تھیں۔ اس طرح اگر قرآن مجید نسلاً بعد نسلٍ سنتے رہنے سے اور متواتر قرأت کی بنیاد پر مسلمانوں کے درمیان رائج نہ ہوتا اور مسلمانوں نے اس کے تحفظ میں حتی الامکان کوشش نہ کی ہوتی تو آج بہت سے الفاظ کی صحیح قرأت محال ہوتی کیونکہ عرب فن تحریر اور اسلوب نگارش سے بے بہرہ تھے۔

مصحف عثمانی کے نسخوں کا انجام

حکومت کے اہل کاروں اور خلیفہ کے کارگذاروں نے ان نسخوں کی ترویج وتحفظ کے لئے بھرپور کوشش کی اور پھر لوگوں کی دلچسپی اور توجہات کی بنا پر یہ نسخے محفوظ رہ گئے۔ بہت طویل عرصہ گذرنے کے بعد ان نسخوں میں کچھ تغیر وتبدل رونما ہوا مثلاً علامت لگانا اور احزاب میں تقسیم کرنا وغیرہ۔ آخر کار ان نسخوں کا رسم الخط قدیم خط کوفی سے جدید خط کوفی میں تبدیل ہوگیا۔ بعد کے زمانوں میں 'نسخ' جیسے خوبصورت رسم الخط اور دوسرے رسم الخطوں میں بھی قرآن لکھا جانے لگا۔ اور آہستہ آہستہ ان تبدیلیوں نے عثمان کے زمانے میں لکھے جانے والے نسخوں کو فراموشی کی نذر کر دیا جس کے بعد ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہ گیا۔

البتہ یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) سے منقول ہے کہ عثمان بن عفان کا مصحف مسجد دمشق میں موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے خود عثمان نے لکھا تھا۔ (معجم البلدان ج/۴ص/۴۶۹)

اس مصحف کو فضل اللہ العمری (متوفی ۷۴۹ھ ق) نے دیکھا بھی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''عثمان کی تحریر میں لکھا ہوا ان کا مصحف مسجد دمشق کے بائیں گوشہ میں موجود ہے۔''

(مسالک الابصار فی ممالک الامصار، ج/۱،ص/۱۹۵)

(یہ بات کسی کتاب میں نہیں ملتی کہ عثمان نے خود اپنے ہاتھوں سے مصحف لکھا ہو، مذکورہ مصحف ہوسکتا ہے وہی شام بھیجا جانے مصحف ہو جو اس زمانے تک محفوظ تھا۔) مشہور سیاح ابن بطوطہ (متوفی ۷۷۹ھ) کے بقول محراب کے روبرو مسجد کے مشرقی حصہ میں ایک بڑا سا صندوقچہ ہے جس میں اہل شام کے لئے عثمان بن عفان کا بھیجا ہوا مصحف رکھا ہوا ہے۔ یہ صندوقچہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد کھولا جاتا ہے اور لوگ اسے چومنے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں نیز باہمی اختلاف اور جھگڑوں کے دور کرنے کے لئے اسی جگہ لوگ قسمیں کھاتے ہیں۔ (رحلۂ ابن بطوطہ ج/۱ص/۵۴)

کہا جاتا ہے کہ دمشق کی مسجد میں یہ مصحف اسی طرح اسی اصلی حالت پر باقی تھا، یہاں تک کہ ۱۳۱۰ھ میں نذر آتش ہو گیا۔ (الخطط ج/۵،ص/۲۷۹)

امام حسینؑ کے حرم مطہر کے خزانے میں خط کوفی میں لکھا ہوا ایک مصحف ہے جسے مصحف عثمان کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس قرآن کے حروف علامتوں سے خالی ہیں اور اس کا حجم بھی بہت زیادہ ہے۔ (اسمیں سورۂ مائدہ کے کلمۂ یَرْتَدَّ کو یَرْتَدِدْ کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ (مائدہ/۵۴)

لہٰذا احتمال قوی ہے کہ اس قرآن کے نسخہ کی نقل مصحف عثمانی سے کی گئی ہو۔

(مناہل العرفان ج/۱ص/۳۹۷،۳۹۸)

رائج مصحف کے تحفظ میں ائمہؑ کا طرز عمل

مصحف عثمانی میں کتابت کی غلطیاں پائی جاتی تھیں۔ پھر حضرت علیؑ نے خلافت ظاہری ملنے کے بعد لوگوں کو بغیر کسی ردو بدل کے، اسی کو اپنائے رکھنے کا حکم دیا تا کہ اصلاح قرآن کے نام پر کوئی بھی شخص اس میں تحریف وتغیر پیدا نہ کر سکے۔ اسی لئے حضرت علیؑ نے تاکید کے ساتھ یہ حکم صادر فرمایا کہ "اِنَّ الْقُرْآنَ لَا یَهَاجُ الْیَوْمَ وَلَا یَحُوْلُ"

(تفسیر طبری ج/۲۷،ص/۱۰۴،تفسیر طبری ج/۹،ص/۲۱۸)

اسی طرح روایت میں ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ کے سامنے عام قرأت کے برخلاف کسی آیت کی تلاوت کی، تو امامؑ نے اس سے کہا کہ" آئندہ اس طرح کی قرأت نہ کرنا۔ جیسے سب لوگ قرآن پڑھتے ہیں تم بھی اسی طرح پڑھو۔" ایک اور شخص نے امام صادقؑ سے تلاوت قرآن کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:" تم نے جس طرح قرآن مجید سیکھا ہے اسی طرح پڑھو۔" یعنی عام مسلمانوں کی طرح۔ (وسائل الشیعہ ج/۴،ابواب قرأۃ القرآن)

اسی وجہ سے علماء شیعہ کا اجماع ہے کہ آج جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے وہی کامل اور جامع قرآن ہے۔ (بحار الانوار ج/۹۲،ص/۴۲_۴۱)

مسلمانوں کے درمیان مشہور قرأت یعنی قرأت حفص صحیح قرأت ہے جسے نماز میں پڑھنا اور دوسرے تمام موارد میں اس سے استناد کرنا بالکل بجا ہے۔

سوالات

۱۔ اتحاد مصاحف کمیٹی کیسے تشکیل پائی؟ اس کے اراکین کے نام بتایئے؟

۲۔ عثمان کے زمانہ میں اتحاد مصاحف کی مہم کن کن مرحلوں سے گذری؟

۳۔ مصحف عثمانی میں سوروں کی ترتیب کس طرح تھی؟

۴۔ مصحف عثمانی کی کتابت سے متعلق دو (۲) کمزور اور منفی نکات بیان کیجئے۔

۵۔ مصحف عثمانی کا انجام کیا ہوا؟

۶۔ خلافت ظاہری ملنے کے بعد مصحف عثمانی کے سلسلہ میں حضرت علیؑ نے کیا موقف اختیار کیا؟

گیارہواں سبق

قرأت اور قارئین قرآن

قرأت قرآن مجید اہم ترین قرانی مسائل میں شمار ہوتی ہے چنانچہ صدر اسلام ہی سے کچھ لوگ اسلامی سماج میں قرأت اور تعلیم قرآن میں منہمک رہے ہیں۔

تاریخ کے گذشتہ ادوار میں قارئین کرام کو چند طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ تقسیم ''طبقات قرّاء'' کے نام سے مشہور ہے۔ پہلا طبقہ ان افراد پر مشتمل ہے جنہوں نے پیغمبرؐ اسلام سے براہ راست قرآن سیکھا اور اس عنوان سے مشہور بھی ہوئے۔ ان کے نام کچھ اس طرح ہیں:

عبداللہ ابن مسعود، ابی ابن کعب، ابوالدرداء اور زید ابن ثابت۔

دوسرے طبقے میں وہ افراد آتے ہیں جنہوں نے طبقۂ اول سے قرآن مجید سیکھا مثلاً عبداللہ ابن عباس، ابوالاسود دوئلی، علقمہ ابن قیس، عبداللہ ابن سائب، اسود بن زید، ابوعبدالرحمن سلمی و مسروق ابن اجدع۔ اس طبقہ بندی نے اسی طرح عہد تدوین قرأت'' تک آٹھ مرحلے کئے گئے۔

قرأت اور قاریوں کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا یہاں تک کہ بغداد کے شیخ القراء ابوبکر ابن مجاہد (۲۴۵۔۳۲۴ھ) نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں سات نامی گرامی قاریوں کی قرأتوں کو رسمی قرار دے دیا۔ بعد کے ادوار میں اس تعداد میں سات قاریوں کا مزید اضافہ ہوگیا۔ اور اس طرح چودہ قرأتیں مشہور ہوگئیں اور چونکہ ہر قرأت دو راویوں سے مروی تھی لہٰذا اٹھائیس قرأتیں رائج ہوگئیں۔

مذکورہ قرأتوں کا حجت ہونا، ان کی صحت اور یہ کہ متواتر طور پر پیغمبرؐ سے منقول ہیں کہ نہیں؟ اس سلسلہ میں بہت سے اقوال پائے جاتے ہیں۔ تحقیق و جستجو کے بعد جواب منفی نظر آتا ہے کیونکہ

محققین کا نظریہ ہے کہ رسولؐ سے فقط ایک ہی قرأت منقول ہوئی ہے اور وہ وہی ہے جو مسلمانوں کے درمیان رائج ہے۔ (التمہید ج/۲ص/۴۲ کے بعد سے اور ص/۲۲۶_۲۱۸)

قرأت کی تعریف

تلاوت اور قرأت دونوں کا مطلب ہے قرآن پڑھنا لیکن اصطلاحاً قرأت کا اطلاق اس تلاوت پر ہوتا ہے جو معروف قاریوں سے کسی ایک کے اجتہاد سے مطابقت رکھتی ہو اور علم قرأت کے اصول وضوابط کے ہم آہنگ ہو۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ قرآن مجید کے لئے منصوص من اللہ قرأت صرف ایک ہے اور قاریوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اسی ایک قرأت تک رسائی کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ قرآن ایک سے زیادہ نہیں ہے اور قرأت کے مسئلہ میں اختلافات راویان وقارئین قرآن کی طرف سے پیدا ہوئے ہیں۔ (اصول کافی ج/۲ص/۶۳۰ ح/۱۲)

اختلاف قرأت کے عوامل واسباب

اختلاف قرأت کے اسباب وعوامل کی بازگشت رسولؐ کی وفات کے بعد صحابہ کے زمانہ تک ہوتی ہے۔ اس زمانے میں صحابہ کے درمیان جمع قرآن اور اس کی ترتیب وتدوین کے موضوع پر اختلاف رونما ہوا اور اسی وجہ سے وقتاً فوقتاً قرأت قرآن کے موضوع پر قاریوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا رہا۔ عثمان کے عہد میں اتحاد مصاحف کا سبب یہی اختلاف تھا۔ اتحاد مصاحف کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد بظاہر اختلاف کو دور ہو جانا چاہئے تھا مگر خود مصحف عثمانی کے نسخوں میں موجود کتابت کی غلطیاں اور املے کے اختلاف ایک نئے اختلاف یعنی ''اختلاف قرأت'' کا سبب قرار پائے۔

مصحف عثمانی کے نسخوں میں اختلاف کے کچھ اسباب ملاحظہ ہوں:

۱- عربی رسم الخط کا ابتدائی مرحلہ میں ہونا :نزول قرآن کا زمانہ عربی رسم الخط کا ابتدائی دور کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے عربوں میں عموماً لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ لہٰذا یہ اسلوب نگارش اور کتابت کے فن سے ناواقف تھے۔ عرب کے ابتدائی رسم الخط میں ایک ہی لفظ کو کئی طرح پڑھے جانے کا احتمال پایا جاتا ہے۔ آخر کلمہ کے 'نون' اور 'یاء' میں اور اسی طرح 'واؤ' اور 'یاء' میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ آخر کلمہ کے 'م' کو 'د' کو کاف کوفی اور وسط کلمہ کے عین کو 'ھ' کی شکل میں لکھتے تھے۔ بعض اوقات ایک ہی کلمہ کے حروف کو الگ الگ لکھ دیتے تھے جیسے 'ی' کبھی 'ی' کو حذف کر دیتے تھے جیسے اِیْلاَفِھِمْ سے اِلاَفِھِمْ یہ چیزیں پڑھنے والے کے لئے بہر حال دشواری اور اشتباہ کا سبب بنتی تھیں۔ اسی طرح ابتدائی رسم الخط میں کبھی کبھی بلاوجہ 'واؤ' اور 'یاء' حذف کر دیئے جاتے تھے جو صرف قرأت میں ہی نہیں تفسیر میں بھی اختلاف کا سبب بن جاتا تھا۔ مثلاً سورۂ تحریم کی آیت نمبر۴ میں 'وصالحو المومنین' سے 'و' حذف کر کے 'وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ' لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کلمے کے مفرد یا جمع ہونے میں تمیز کرنا مشکل ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مصحف عثمانی کے نسخوں کے رسم الخط میں اس قسم کی خامیوں نے بے شمار مشکلات کو جنم دیا۔

۲- حروف کا بے نقطہ ہونا :حروف کا نقطوں سے خالی ہونا اختلاف قرأت کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے کیونکہ اس دور کے رسم الخط میں نقطہ دار اور بے نقطہ حروف میں کوئی فرق نہیں تھا۔ لہٰذا 'س'، 'ش'، 'ب'، 'ت'، 'ث'، 'ج'، 'ح'، 'خ' اور اسی طرح کے دوسرے حروف میں کوئی فرق وامتیاز نہیں ہوتا تھا۔ سیاق وسباق اور جملہ کے مفہوم سے واقفیت کے سہارے ہی صحیح قرأت ممکن ہو سکتی تھی۔

اس سبب سے وجود میں آنے والے اختلافات قرأت کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

ابن عامر اور اہل کوفہ نُنْشِزُھا (بقرہ/۲۵۹) پڑھتے تھے جبکہ دوسرے مسلمان نَنْشُزُھَا پڑھتے تھے۔

۳۔ **حرکات و علمات کا نہ ہونا** : چونکہ اس رسم الخط میں الفاظ پر اعراب و علامات نہیں تھے لہٰذا غیر قاریٔ قرآن کے لئے کلمات کے وزن اور حرکت کی پہچان کافی دشوار تھی، عجم تو عجم بعض الفاظ خود عربوں کے لئے غیر صحیح ہو کے رہ جاتے تھے۔ مثلاً لفظ 'اعلم' کہ جو فعل امر اور مضارع متکلم بھی ہوسکتا ہے اور افعل التفضیل اور باب افعال سے فعل ماضی بھی۔ اسی وجہ سے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۹ "قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" میں حمزہ اور کسائی نے اِعْلَمُ پڑھا ہے جبکہ دوسروں نے اسے 'اَعْلَمُ' فعل مضارع صیغہ واحد متکلم شمار کیا ہے۔

۴۔ **لفظوں میں الف کی عدم موجودگی** : اس زمانے کے رسم الخط میں الف کا نہ ہونا بھی اختلاف قرأت کا ایک سبب ہے۔ خط کوفی کا سرچشمہ خط سریانی ہے اور خط سریانی میں وسط کلمہ میں الف لکھنا رائج نہیں تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں قرآن کوفی رسم الخط میں لکھا جاتا تھا لہٰذا لفظ کے بیچ آئے ہوئے الف کو حذف کر دیتے تھے۔ مثلاً 'سماوات' کے بجائے 'سموات' لکھتے تھے۔ علاقوں کی ایجاد کے بعد سماوات کے الف کو چھوٹے الف کی شکل میں 'م' اور 'و' کے اوپر لکھ دیا گیا 'سمٰوٰت'۔

لفظ کے درمیان سے الف گرا دینے کے نتیجہ میں بھی قرأت قرآن میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے، مثلاً نافع ابوعمرہ اور ابن کثیر نے "مَا يَخْدَعُوْنَ" (بقرہ/۹) کو "مَا يُخَادِعُوْنَ" پڑھا ہے۔ انہی اسباب کی بنا پر قاریان قرآن آپسی اختلاف کا شکار ہوئے اور ہر ایک نے اپنے اجتہاد اور دلائل کو معیار بنا کر اپنی اپنی قرأت کی توجیہ بیان کی۔

مشہور قرأتوں کی تدوین

صدر اسلام کے مسلمان اصحاب رسولؐ سے قرآن سنتے، سیکھتے اور انہیں کی طرح پڑھتے تھے۔ اصحاب رسولؐ کے بعد تابعین اور مقامی علماء سے عام مسلمانوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ البتہ اس زمانے کے علماء صرف قرأت قرآن ہی میں مہارت نہیں رکھتے تھے بلکہ دوسرے علوم میں بھی پیش پیش تھے۔ بعد میں کچھ علماء نے اپنی ساری توجہات اور محنتوں کا مرکز فن قرأت کو بنا کر اس میں خاصی مہارت اور شہرت حاصل کر لی۔ مختلف علاقوں سے آ کر لوگ ان سے قرآن سیکھنے لگے اور ہر شہر کا قاری اس شہر اور اس کے گرد و نواح میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے قرأت کا امام اور مرجع بنتا گیا۔ رفتہ رفتہ اس تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ چیز سارے بلاد اسلامیہ میں رائج ہوگئی۔ بہت سے قاری اپنے اپنے اجتہاد، انداز اور لہجے کے مطابق تعلیم قرآن میں مشغول ہو گئے۔ بعض نے اس سلسلہ میں کوتاہی اور سہل پسندی بھی برتی اور بقول ابن الجزری اس بات کا خطرہ لاحق ہو گیا کہ اختلاف قرأت کے طوفان میں حق و باطل اس طرح مخلوط ہو جائیں کہ جدائی ناممکن ہو جائے۔

(النشر فی القرأت العشر ج/۱ ص/۹)

اسی طوفان کو روکنے کے لئے بزرگوں نے قرأت کے لئے اصول و ضوابط مقرر کر دیئے۔ جس معتبر شخص نے سب سے پہلے صحیح قرأتوں کو جمع کر کے ایک مفصل اور ضخیم کتاب مرتب کی وہ ابوعبید قاسم بن سلام انصاری (متوفی ۲۲۴ھ) تھے۔ ابن الجزری نے قاریوں کی تعداد ۲۵ پر منحصر کر کردی ہے جس میں ساتوں قاری شامل ہیں جو قرأء سبعہ کہلاتے ہیں۔ (سابق ص/۳۴)

ابوعبید قاسم کے علاوہ بھی دوسرے دانشوروں نے قرأت قرآن کی تدوین فرمائی ہے جس کی تفصیل دوسری کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (علوم قرآنی ص/۲۲۷، ۲۲۳)

صرف سات قرأتیں

اختلاف قرأت کا یہ سلسلہ اسی طرح چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ بغداد کے ہر دلعزیز مشہور دانشور اور مقبول خاص و عام عالم ابن مجاہد میدان میں آگئے اور حکومتی پیمانہ پر 'شیخ القرّاء' کا منصب سنبھال لیا اور لوگوں نے انہیں قبول بھی کرلیا۔

ابن مجاہد بڑے سخت گیر قدامت پسند تھے۔ وہ اسلاف کی قرأتوں پر شدت سے پابند تھے اور جدید قرأتوں کے سخت مخالف تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اسلاف کی زحمتوں کا تحفظ اور ان کی قرأتوں کی ترویج جدید قرأتوں کے رواج دینے سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

(معرفۃ القراء الکبار ج/۱ ص/۲۱۷)

ابن مجاہد نے اجتہاد قرأت کا سدباب کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اس زمانے کے حالات اور تقاضوں نے ان کی کامیابی اور مخالفین کی شکست میں خاصی مدد کی۔ ساری قرأتوں کو سات قرأت میں محدود کردینا ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، البتہ قرأت کے محدود کردینے کے سلسلہ میں نقائص اور کوتاہیوں کے ذمہ دار بھی وہی ہیں کہ اتنے بڑے کام میں بہت جلد بازی سے کام لیا۔

ڈاکٹر صبحی صالح کہتے ہیں کہ اس توہمی نظریہ کہ صرف سات ہی قرأت معتبر ہے۔ اس کے سلسلہ میں سب سے زیادہ ملامت کے مستحق ابن مجاہد ہیں جنہوں نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں مکہ، مدینہ، بصرہ، کوفہ اور شام کے سات ائمۂ قرأت کی قرأتوں کو جمع کر کے معتبر، صحیح اور دقیق قرار دیا۔ حالانکہ یہ کسی بھی معیار سے قابل عمل نہیں۔ یہ محض ایک اتفاق اور چانس تھا ورنہ ائمۂ قرأت میں ایسے بہت سے افراد ہیں کہ جو قرّاء سبعہ سے کہیں بہتر اور برتر ہیں۔

(مباحث فی علوم القرآن ص/ ۲۴۷ اور ۱۴۸)

بہر حال شدید مخالفتوں کے باوجود (حکومت کی مدد سے) ابن مجاہد نے ساری قرأتوں کو سات قرأت میں محدود کردیا۔ ان سات قرأتوں کے مندرجہ ذیل ایک ایک قاری اور دو دو راوی ہیں جو آگے درج کئے جارہے ہیں۔

قرّاء سبعہ اور ان کے راوی

۱۔ابن عامر : قاریٔ شام، عبداللہ بن عامر یحصبی (متوفی ۱۱۸ھ)

راویان قرأت: حضرت ہشام بن عمار (۲۴۵۔۱۵۳) ابن ذکوان (۲۴۲۔۱۷۳)

۲۔ابن کثیر : قاریٔ مکہ، عبداللہ بن کثیر داری (متوفی ۱۲۰)

راویان قرأت : بزی (۲۵۰۔۱۷۰)، قنبل (۲۹۵۔۱۹۱)

۳۔عاصم : قاریٔ کوفہ، عاصم بن ابی النجو داسدی (متوفی ۱۲۸ھ)

راویان قرأت: حفص بن سلیمان (۱۸۰۔۹۰)، شعبہ ابوبکر بن عیاش (۱۹۳۔۹۵)

حفص عاصم کی قرأت زیادہ بہتر طور پر جانتے تھے۔ انھوں نے ہی اسے نشر کیا جو آج اکثر وبیشتر اسلامی ممالک میں رائج ہے۔

۴۔ابوعمرو : قاریٔ بصرہ، زبان ابوعمرو بن علاء مازنی (متوفی ۱۵۴ھ)

راویان قرأت : حفص بن عمر (متوفی ۲۴۶ھ)، سوسی صالح بن زیاد (متوفی ۲۶۱ھ)

۵۔حمزہ : قاریٔ کوفہ، حمزہ بن حبیب زیات (متوفی ۱۵۶ھ)

راویان قرأت : خلف بن ہشام (۲۲۹۔۱۵۰) خلاد بن خالد (متوفی ۲۲۰)

یہ دونوں ان کے بالواسطہ شاگرد ہیں۔

۶۔نافع : قاریٔ مدینہ، نافع بن عبدالرحمن اللیثی (متوفی ۱۶۹)

راویان قرأت : عیسیٰ بن مینا، (۲۲۰۔۱۲۰) معروف بہ قالون وورش۔

عثمان بن سعید (۱۹۷۔۱۱۰) یہ قرأت آج بعض مغربی عرب ممالک میں رائج ہے۔

۷۔کسائی : قاریٔ کوفہ، علی بن حمزہ (متوفی ۱۸۹ھ)

راویان قرأت : لیث بن خالد (متوفی ۲۴۰) حفص بن عمر (متوفی ۲۴۶)

بعد میں تین مزید قاریوں کا اضافہ کر کے سات قاریوں کو دس قاریوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ دوسرے چار قاریوں کو بھی جو خلاف مشہور قرأت کرتے تھے لیکن عوامی سطح پر مقبول تھے، اس فہرست میں شامل کر کے قرّاءِ اربعہ عشر یعنی چودہ قاریوں کی تعداد مکمل کر لی گئی۔ ان سب کے نام اور سوانح حیات کے لئے علوم قرآن ص/ ۱۹۹۔۱۹۰ اور التمہید ج/۲، ص/ ۲۳۱۔۲۲۶ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ابن عامر اور ابو عمرو کے علاوہ قرّاءِ سبعہ میں اور سب قاری ایرانی الاصل ہیں۔ ابن عامر مجہول النسب اور ابو عمرو کا تعلق قبیلۂ مازن تمیم سے ہے، لیکن قاضی اسد یزیدی کے بقول ''وہ ایران کے شہر شیراز کے کازرون نامی دیہات کے باشندے تھے۔'' عاصم، ابو عمرو، حمزہ اور کسائی صریحاً اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ ابن کثیر اور نافع بھی ایرانی ہونے کے سبب احتمالاً شیعہ تھے۔ لیکن ابن عامر بنی امیہ کا پروردہ لا ابالی اور ناکارہ تھا۔

سوالات

۱۔ طبقات قرّاء کا کیا مطلب ہے؟ طبقۂ اول میں شامل افراد کے نام بتایئے۔

۲۔ دوسرے طبقے کے چار قاریوں کے نام بیان کیجئے۔

۳۔ اصطلاحاً قرأت کے معنی بیان کرتے ہوئے قرأت اور تلاوت کا فرق واضح کیجئے۔

۴۔ اختلاف قرأت کے اہم ترین عوامل کیا تھے؟

۵۔ کیا سارے قرّاءِ سبعہ معتبر اور شائستہ تھے؟ وضاحت کیجئے۔

۶۔ قرّاءِ سبعہ میں سے چار کے نام بتایئے۔ آج اسلامی ممالک میں کون سی قرأت رائج ہے؟

بارہواں سبق

قرأت حفص

قرأت حفص کی وضاحت سے پہلے ضروری ہے کہ کسی قرأت کے قابل قبول ہونے کے معیاروں پر ہلکی سی روشنی ڈال دی جائے۔

قرأت کے قابل قبول ہونے کا معیار

کسی بھی قرأت کے قابل قبول ہونے کا سب سے اہم معیار یہ ہے کہ وہ قرأت قرّاء کی قرأتوں سے قطع نظر عام مسلمانوں کے درمیان رائج قرأت سے ہم آہنگ ہو، بالفاظ دیگر قرآن مجید دو ذرائع سے ہم تک پہونچا ہے۔

الف) امت مسلمہ کے ذریعہ: مسلمانوں نے سینہ بسینہ اپنے آباء واجداد سے اور انھوں نے پیغمبرؐ اسلام سے قرآن کریم سیکھا اور موجودہ نسل تک منتقل کیا۔ یہ وہی قرأت ہے جس کے مطابق موجودہ قرآن لکھا گیا ہے اور عالم اسلام میں ہمیشہ سے یہی قرأت رائج رہی ہے۔

ب) قرّاء کی قرأت کے ذریعہ: یہ قرأتیں درحقیقت فن قرأت کے ماہرین کی رائے اور اجتہاد کا نتیجہ ہیں اور رسولؐ سے منقول نہیں ہیں جبکہ نصوص قرآنی میں ذاتی نظریہ اور اجتہاد کو شرعی طور سے حجت کی حیثیت اور جواز حاصل نہیں ہے۔ البتہ قرأت عاصم بروایت حفص اس قسم کے اجتہاد اور نظریات سے مبرّا ہے۔

چونکہ یہ قرأت دوسری قرأتوں کے برخلاف مستند اور منقول ہے اس قرأت کی روایات کا سلسلہ حضرت علیؑ سے گذرتا ہوا رسول اسلام تک پہنچتا ہے اور آج سارے مسلمانوں کے درمیان اس قرأت کے رائج ہونے کا راز بھی یہی ہے کہ یہ قرأت معتبر ذرائع سے پیغمبرؐ اسلام سے نقل کی گئی ہے اور یہی قرأت اس قرأت کے مطابق ہے جو نسلاً بعد نسلٍ پیغمبر اسلامؐ سے مسلمانوں تک پہونچی۔

جمہور مسلمین نے صحیح اور متواتر قرأت کے لئے تین شرطیں بیان کی ہیں:۔

۱۔ موجودہ قرآن سے مطابقت رکھتی ہو۔ چونکہ ہر دور کے مسلمانوں نے نہایت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ قرآن کو ثبت وضبط اور محفوظ کیا ہے۔ اس طرح پوری دنیا میں ہاتھ سے لکھے ہوئے یا پریس میں چھپے ہوئے سبھی قرآن ایک جیسے ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

۲۔ عربی زبان کے فصیح ترین اور مشہور ترین اصول وقواعد کے مطابق ہو۔ چونکہ قرآن فصیح ترین عربی میں نازل ہوا ہے جس میں عربی زبان کے غیر معیاری پہلوؤں کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۳۔ عقل وشریعت کے اصول وقوانین سے ہم آہنگ ہو۔ چونکہ قرآن شریعت کی بنیاد ہے اور صحت مند اور جامع ومکمل عقلی قوانین کا سرچشمہ ہے، ان سے ٹکراؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قرأت حفص کے امتیازات

یہی وہ قرأت ہے جو بالکل صحیح السند اور صرف اسی کو جمہور مسلمین کی حمایت اور تائید حاصل ہے اور مندرجہ ذیل امتیازات کی بناء پر ہی قرأت ان کے درمیان رائج رہی ہے۔

(۱) شہرت اور عام مسلمانوں میں رائج قرأت سے مطابقت

دراصل حفص کی قرأت عام مسلمانوں ہی کی قرأت ہے کیونکہ حفص اور ان کے استاد عاصم اسی قرأت کو قبول کرتے تھے جو مسلمانوں میں رائج ہوا اور متواتر روایات کے مطابق ہو۔ یہ قرأت عاصم نے اپنے استاد شیخ عبدالرحمن سلمی اور انھوں نے حضرت علیؑ اور آپ نے رسولؐ اکرم سے نقل فرمائی ہے۔

(۲) راویوں کا موثق ہونا

عاصم، قاریوں کے درمیان ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ وہ قرأت قرآن کے سلسلہ میں بہت محتاط تھے۔ اسی وجہ سے حضرت علیؑ کے شاگرد ابوعبدالرحمن سلمی کے علاوہ کسی اور سے قرأت کا ایک حرف بھی قبول نہیں کیا۔ (معرفۃ القراء الکبار، ج/۱،ص/۷۵)

عاصم کی قرأت کو بلاد اسلامیہ میں رواج دینے والے حفص بھی اپنے استاد ہی کی طرح نہایت محتاط، شائستہ اور برجستہ انسان تھے۔ یہ علم قرأت میں اپنے استاد عاصم کے سب سے نمایاں اور ممتاز شاگرد تھے۔ اسی وجہ سے عاصم کی قرأت سیکھنے کے لئے سارے مسلمان آپ ہی کو ترجیح دیتے تھے۔

ابوعمرو دانی کہتے ہیں: حفص، مسلمانوں کو عاصم کی قرأت سکھاتے تھے اور اس کی ترویج میں کوشاں رہتے تھے۔ انھوں نے بغداد اور مکہ میں بھی عاصم کی قرأت سکھانے کا بیڑا اٹھایا۔

(طبقات القراء، ج/۱،ص/۲۵۴)

شاطبی نے ان کی تعریف اس طرح فرمائی کہ علم قرأت میں باریکی، پختگی اور مہارت کے لحاظ سے حفص کا مرتبہ دوسروں سے کہیں برتر ہے۔ (شرح الشاطبیہ،ص/۱۴)

(۳) بزرگ علماء کی طرف سے تائید اور سند قبولیت

تاریخ کے ہر دور میں عاصم کی قرأت کا غلبہ رہا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں بغداد کے شیخ القراء ابن مجاہد کے درس قرأت میں ۱۵ر افراد عاصم کی قرأت کے ماہر تھے اور ابن مجاہد صرف عاصم ہی کی قرأت کا درس دیتے تھے۔

(معرفۃ القراء الکبار ج/۱،ص/۲۱۷)

نفطویہ ابراہیم بن محمد (متوفی ۳۲۳ھ) ۵۰ سالہ تدریس قرأت کا تجربہ رکھنے والے اپنے درس کا آغاز عاصم کی قرأت سے کرتے تھے اور دوسروں کی قرأت بعد میں تعلیم دیتے تھے۔

(لسان المیزان ج/۱،ص/۱۰۹)

احمد ابن حنبل بھی کہتے ہیں: ''عاصم قابل اعتماد تھے اور میں نے ان ہی کی قرأت اختیار کی ہے۔ (میزان الاعتدال ج/۲،ص/۳۵۸)

اسی طرح دوسرے ائمۂ قرأت اور ماہرین فن کی کوشش بھی یہی رہی ہے کہ وہ اپنی قرأت کے سلسلہ کو عاصم سے ملائیں۔

(۴) عاصم کی قرأت کے سلسلہ کا حضرت علیؑ تک پہنچنا

عاصم کی قرأت صحیح السند اور معتبر ہونے میں اپنی مثال آپ ہے کیونکہ:

اولاً: عاصم نے قرأت کے حوالے سے اپنے استاد ابوعبدالرحمن سلمی کے علاوہ کسی سے کچھ نہیں سیکھا۔

دوسرے: جیسا کہ خود عاصم نے کہا کہ قرأت کے سلسلہ میں میرے اور استاد کے درمیان کبھی اختلاف نہیں ہوا اور نہ ہی میں نے اپنے استاد کی کبھی مخالفت کی کیونکہ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ ابوعبدالرحمن سلمی نے حضرت علیؑ کی قرأت میں ذرہ برابر بھی ردوبدل نہیں کیا۔

(معرفۃ القراء الکبار، ج/۱،ص/۷۵)

تیسرے: عاصم نے یہ سنہرا اور بہترین سلسلۂ سند فقط اپنی گود کے پالے اور اپنے مایہ ناز شاگرد حفص (حفص عاصم کے سوتیلے بیٹے تھے اور ان ہی کی گود میں پلے بڑھے تھے) تک منتقل کیا۔ اس وجہ سے ان کی قرأت میں اختلاف پیدا نہ ہو سکا اور اسی بنا پر عاصم کی قرأت سیکھنے کے لئے سارے مسلمان حفص ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

قرأت سبعہ کا اعتبار

قرأت سبعہ حجت اور معتبر ہیں کہ نہیں؟ اور کیا نمازی ان میں جسے چاہے اپنی نماز کے لئے انتخاب کر سکتا ہے؟ زیادہ تر فقہاء کا جواب مثبت ہے۔

سید محمد کاظم یزدی طاب ثراہ 'عروۃ الوثقیٰ' میں اور سید ابوالحسن اصفہانی طاب ثراہ 'وسیلۃ النجاۃ' میں رقمطراز ہیں کہ ''احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ نمازی قرأت سبعہ سے تجاوز نہ کرے۔'' امام خمینیؒ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ آیۃ اللہ خوئیؒ کے نزدیک نماز میں صرف ائمہ اہلبیتؑ کے زمانے میں رائج قرأتیں جائز اور درست ہیں۔ فقہاء کے درمیان مشہور یہی ہے کہ قرأت سبعہ میں سے کسی کو بھی اپنایا جاسکتا ہے جبکہ امام صادقؑ سے روایت ہے: ''قرآن ایک ہے اور ایک خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، اختلاف کا سبب راوی حضرات ہیں۔''

لیکن فقہاء اپنے دعوے کی دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں: "اِقْرَأُوْا کَمَا یُقْرَأُ النَّاسَ" ''قرآن ویسے پڑھو جیسے عام لوگ پڑھتے ہیں۔'' البتہ محسن حکیم طاب ثراہ شرح 'عروۃ الوثقیٰ' میں فرماتے ہیں کہ مذکورہ روایت قرأت سبعہ کو جائز اور حجت نہیں کرسکتی کیونکہ قرأت سبعہ چوتھی صدی ہجری میں وجود میں آئیں اور اس حدیث کا تعلق دوسری صدی ہجری سے ہے۔

(مستمسک العروۃ الوثقیٰ ج/۶، ص/۲۴۲ تا ۲۴۵)

اسی وجہ سے آپ مذکورہ حدیث کو ائمہؑ کے زمانے میں رائج قرأتوں سے مطابقت دیتے ہیں جن کی تعداد سات سے زیادہ تھی اور آپ کے نظریہ کی رو سے ائمہؑ کے زمانہ میں جس قرأت کی عمومی سطح پر شہرت و مقبولیت ثابت ہوجائے وہ جائز اور درست ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارا اپنا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے اس کے رسولؐ پر نازل ہونے والا قرآن ایک تھا اور وہ وہی قرآن ہے جو آج تک لوگوں کے پاس محفوظ ہے اور صحیح قرأت وہی ہے جو نسلاً بعد نسلٍ رسولؐ کے ذریعہ لوگوں تک پہنچی ہے۔ اس قرأت میں اور قرّاء کے ذاتی نظریات و اجتہادات پر مبنی قرأت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

امام بدرالدین زرکشی (البرہان ج/۱، ص/۳۱۸) اور آیۃ اللہ خوئیؒ (البیان ص/۱۷۳) جیسے بزرگوں کا نظریہ ہے کہ قرآن اور قرأت دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ قرآن پیغمبرؐ پر نازل شدہ وحی ہے اور قرأت اس وحی تک پہنچنے میں قاریان قرآن کا اختلاف ہے جو زیادہ تر ان کے ذاتی اجتہادات پر مبنی ہے۔''

لہٰذا حدیث شریف "اِقْرَأُوْا کَمَا یُقْرَأُ النَّاسَ" اس قرأت کی طرف اشارہ کررہی ہے جو آج لوگوں کے درمیان رائج ہے اور رسول اکرمؐ سے میراث ملی ہے اور شرعی طور پر یہی قرأت حجت ہے۔ ماضی کی تاریخ میں ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن ہوں یا گذشتہ چند صدیوں کے چھپے ہوئے قرآن ہوں، تمام اسلامی ممالک میں بالکل ایک جیسے ہیں اور یہ وہی حفص کی قرأت ہے جسے سارے مسلمانوں نے تسلیم کرلیا ہے۔

امام خمینیؒ نے فرمایا: ''احوط یہی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان موجود اور رائج قرآن کی کتابت و طباعت میں کسی طرح کا ردوبدل نہ کیا جائے۔ (تحریر الوسیلہ ج/۱، ص/۱۵۲، م/۱۴)

قرأت قرآن کے بارے میں اہلبیتؑ کے ارشادات

قرآن کے بارے میں ائمہؑ کے ارشادات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے قرآن کو تحریف اور ترمیم سے بچانے کے لئے کتنی کوششیں کی ہیں۔ کچھ نمونے ذیل کی سطروں میں درج کئے جارہے ہیں:

۱۔ محمد بن ورّاق سے منقول ہے کہ میں نے امام صادقؑ کو ایک ایسا قرآن دکھایا جس میں علامتیں سونے سے لکھی ہوئی تھیں اور قرآن کے آخر کا ایک سورہ بھی سونے سے تحریر تھا۔ اگرچہ اس میں کسی قسم کی کوئی کمی اور زیادتی نہیں تھی، مگر پھر بھی امامؑ نے فرمایا: ''میں نہیں چاہتا کہ قرآن سیاہ روشنائی کے علاوہ کسی اور رنگ سے لکھا جائے، اس لئے کہ پہلی مرتبہ سیاہ روشنائی سے ہی لکھا گیا تھا۔''

امامؑ کا یہ ارشاد حفاظت قرآن کے سلسلہ میں آپ کی بے پناہ توجہ کا پتہ دیتا ہے یہاں تک کہ رنگ اور روشنائی بھی امامؑ نے وہی ترجیح دی جس سے پہلی مرتبہ لکھا گیا تھا۔

۲۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: ''قرآن ایک ہے اور ایک خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، اس کی قرأت میں اختلافات راویوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔''

اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کی طرف سے ایک ہی قرأت نازل ہوئی ہے اور منصوص من اللہ

قرآن ایک ہی ہے اور اس نص الٰہی کے نقل و روایت میں اختلاف قاریوں کے اجتہاد کا نتیجہ ہے۔

۳۔ امام صادقؑ نے فرمایا: ''قرآن ایک خدا کی طرف سے آیا ہے۔ اس کی صحیح قرأت ایک ہے۔''

امامؑ کا یہ جملہ ساری قرأتوں کی نفی کرتا ہے جو لوگوں کے درمیان اس عنوان سے رائج نہیں کہ یہ پیغمبرؐ سے منقول متواتر قرأتیں ہیں۔ البتہ واضح رہے کہ امامؑ نے لہجہ کے اختلاف کی نفی نہیں کی ہے۔

۴۔ سالم بن سلمہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ کے سامنے قرآن سے کچھ آیتوں کی تلاوت کی اور جیسا کہ میں نے سنا، اس کی قرأت عام قرأت سے الگ تھی۔ امامؑ نے اس سے فرمایا: ''یہ قرأت ترک کر دو اور تم بھی قرآن ویسے پڑھو جیسے عام لوگ پڑھتے ہیں۔'' شاید اس شخص نے قاریوں کی فنکاریوں کے مطابق مختلف انداز میں قرآن کی تلاوت کی ہو اور چونکہ اس طرح کی فنکارانہ قرأتیں نص قرآن سے کھلواڑ کے مانند ہیں، لہٰذا امامؑ نے اسے روکا ہو اور عام لوگوں میں رائج قرأت کے اپنانے کا حکم دیا ہو کیونکہ صحیح قرأت جسے اپنانے کا شریعت نے حکم دیا ہے وہ عام اور رائج قرأت ہے۔

شیعہ اور موجودہ قرآن

کچھ نافہم لوگوں نے شیعوں پر تہمت لگائی ہے کہ ان کا اپنا مخصوص مصحف ہے جس کا نام "المصحف الشیعہ" ہے۔ جبکہ خود شیعوں کو اس کی مطلقاً خبر نہیں ہے۔ بہت سے محققین نے اس تہمت کی شدت سے مذمت اور تردید کی ہے۔ جن میں مشہور و معروف مستشرق اگناز گولڈزیہر Ignaz Gold Zihar کا نام سرفہرست ہے۔ اس نے موجودہ قرآن سے شیعوں کے گہرے ارتباط کی تائید کی ہے۔

موجودہ قرآن سے شیعوں کے عمیق تعلق اور اس کے تحفظ میں شیعوں کی زحمتیں بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ذیل کی سطروں میں کچھ مطالب درج کئے جا رہے ہیں :

اگر تاریخ قرآن کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ قرآن درحقیقت شیعوں ہی کی زحمتوں کا نتیجہ ہے اور دراصل اگر کسی قرآن کو شیعوں کا قرآن کہا جا سکتا ہے، تو وہ یہی رائج قرآن ہے جسے ائمہ اہل بیتؑ اور شیعہ حفاظ و قاریان قرآن اور دوسرے اہل فن حضرات کی کوششوں اور زحمتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شیعوں کی طرف منسوب کرنا چاہئے۔

پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد حضرت علی علیہ السلام وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن مجید جمع کیا (اور آپ شیعوں کے امام ہیں۔) اتحاد قرآن سے پہلے جو اہم ترین مصحف مسلمانوں میں رائج تھے اور جن کے مطابق موجودہ قرآن مرتب ہوا وہ عبداللہ ابن مسعود، ابی ابن کعب، ابوالدرداء اور مقداد بن اسود کے مصحف ہیں۔ یہ سب کے سب اہل بیتؑ کے نامی گرامی شیدائی تھے۔ عثمان کے زمانے میں سب سے پہلے اتحاد قرآن کی پیشکش حذیفہ یمانی نے کی، نسخہ سے نقل کرنے کے وقت قرآن لکھنے والے ابی ابن کعب تھے، قرآن پر اعراب اور نقطہ ابوالاسود دوئلی اور ان کے دو شاگرد نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر نے لگائے، کتابت قرآن کی زینت و آرائش کا کام سب سے پہلے حضرت علیؑ کے صحابی خالد بن ابی الہیاج نے انجام دیا۔ موجودہ شکل میں قرآن کے حرکات و سکنات کی تنظیم علم تجوید اور فن قرأت کے مایہ ناز استاد خلیل بن احمد فراہیدی کے ذریعہ عمل میں آئی۔ یہی وہ شخص ہیں جنہوں نے ہمزہ، تشدید، زبر، زیر، پیش، وقف رَوم (وقف کی ایک مخصوص قسم جس میں موقوف علیہ کی ایک تہائی حرکت نہایت خفیف آواز میں تلفظ ہوتی ہے اس کا محل فقط ضمہ (پیش) اور کسرہ (زیر) ہے جیسے نستعینُ، اور "من قبلِ" میں وقف کی صورت میں ن اور لام کو اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ ضمہ اور کسرہ کی ہلکی سی آواز باقی رہے۔) اور اشمام کو وضع کیا اور یہ سارے حضرات شیعوں کے مشہور و معروف دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں۔

قراء سبعہ میں سے اگر چھ نہیں تو کم از کم چار افراد بہر حال شیعہ تھے اور موجودہ قرأت یعنی حفص کی قرأت، خالص شیعہ قرأت ہے جسے امام صادقؑ کے صحابی حفص نے اپنے استاد یعنی مشہور و

معروف شیعہ عالم دین عاصم اور عاصم نے اپنے استاد سلمی سے سیکھا جو حضرت علیؑ کے خاص صحابیوں میں تھے۔ اور سلمی نے حضرت علیؑ سے اور آپ نے رسولؐ اسلام سے اور رسولؐ نے خدائے عزوجل سے اکتساب فرمایا۔

سوالات

۱۔ قرآن کن کن ذرائع سے ہم تک پہنچا؟ ان میں سے کون معتبر ہے؟

۲۔ صحیح اور متواتر قرأت کے شرائط بیان کیجئے۔

۳۔ عاصم سے منقول قرأت حفص کے کوئی تین امتیازات بیان کیجئے۔

۴۔ کیا حدیث شریف "اِقْرَأُوْا کَمَا یُقْرَأُ النَّاسَ" قرأت سبعہ کے لئے حجت اور جائز قرار دینے والی ہوسکتی ہے؟ وضاحت کیجئے۔

۵۔ ائمہ معصومینؑ کی کوئی ایسی حدیث بیان کیجئے جس سے تحفظ قرآن کے سلسلے میں ان کی زحمتوں کا پتہ چل سکے۔

۶۔ ''موجودہ قرآن ہی شیعوں کا قرآن ہے۔'' اس دعویٰ کی دلیل پیش کیجئے۔

تیرہواں سبق

ناسخ ومنسوخ

اصلاح اور ترقی کی راہ میں ہونے والا اقدام مختلف مراحل اور بدلتے ہوئے حالات کے سبب قوانین میں ترمیم وتنسیخ یعنی نظر ثانی نسخ سے بہر حال دوچار ہوتا ہے۔ یہ نظر ثانی اور تنسیخ ان آسمانی اور الٰہی شریعتوں میں بھی پائی جاتی ہیں جن کا کام ہے انسانی زندگی کے ہمہ گیر اصول وضوابط کی نشاندہی (البتہ یہ نظر ثانی اور ترمیم اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک تحریک آخری منزل اور مطلوبہ کمال تک نہ پہونچ جائے۔ اسی وجہ سے کسی بھی شریعت میں ترمیم وتنسیخ کا امکان اسی وقت تک پایا جاتا ہے جب تک اس شریعت کا پیغمبر تبلیغ رسالت میں مصروف ہو لیکن رسالت کے ختم ہونے اور پیغمبر کے وفات پاجانے کے بعد جو شریعت کے کامل ہوجانے کا ثبوت ہے شریعت میں ترمیم وتنسیخ کا امکان باقی نہیں رہ جاتا۔)

ایک نئی شریعت میں ترمیم وتنسیخ ہونا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مریض کے حالات اور مزاج بدلنے کے ساتھ نسخے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کل کا نسخہ اپنی جگہ مفید تھا اور آج کا نسخہ اپنی جگہ مفید ہے۔ چنانچہ خداوند متعال فرماتا ہے: "مَانَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا..."

"اور اے رسول ہم جب کسی بھی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا دلوں سے محو کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی جیسی آیت ضرور لے آتے ہیں...." بقرہ/۱۰۶

مذکورہ آیت کے ذریعہ معلوم ہوا کہ شریعت میں ہونے والی ہر ترمیم وتنسیخ اپنی جگہ درست ہے اور اس کے ذریعہ درحقیقت وقت اور ماحول کے اعتبار سے بہتر کا انتخاب کیا گیا ہے۔ گذشتہ بیان

کے ذریعہ نسخ کی تعریف ایک حد تک واضح ہوگئی ہوگی۔

اصطلاحاً نسخ کا مطلب ہوتا ہے: نئے حکم کی آمد سے سابقہ حکم کا جو بظاہر دائمی تھا اس طرح ختم ہوجانا کہ نیا حکم پرانے حکم کی جگہ پر ہوجائے اور دونوں ایک ساتھ جمع نہ ہوسکیں۔ ہوسکتا ہے یہاں پہنچ کر ذہنوں میں شبہہ پیدا ہو کہ پھر قرآن کریم میں منسوخ آیتوں کے وجود کا فائدہ کیا؟ ان آیتوں کی تلاوت کے کیا معنی اور وہ بھی بے معنی الفاظ کی؟

اس سوال کا جواب کچھ اس طرح ہے:

اولاً یہ کہ قرآن مجید میں ناسخ اور منسوخ آیات کے سہارے مرحلہ بہ مرحلہ تدریجی طور پر قوانین بننے اور تشریع احکام کا سراغ ملتا ہے اور یہ بات ایک تاریخی اور دینی اہمیت کی حامل ہے جس سے شریعت کے ارتقائی مراحل کا پتہ ملتا ہے۔

دوسرے "اعجاز بیانی" قرآن کا ایک بڑا اہم پہلو ہے جسے ہمیشہ اور ہر صورت میں برقرار رہنا چاہئے۔

تیسرے اکثر وبیشتر منسوخ آیتیں یعنی حالات اور شرائط کی وجہ سے نسخ ہوئی ہیں پس اگر نسخ سے پہلے والے حالات دوبارہ پیدا ہوجائیں تو وہ آیتیں پھر سے بحال اور نافذ ہوجائیں گی۔

نسخ کے شرائط

نسخ کے شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نسخ احکام شرعی کے دائرے میں ہو یعنی ہر وہ ترمیم اور ردوبدل جو شرعی دائرے سے ہٹ کر عمل میں آئے، نسخ کے موضوع بحث سے خارج ہے۔

۲۔ موضوع کا حکم نہ بدلے۔ اختیاری حالت میں بدلنا یا حضر کا سفر میں بدلنا ان حالات میں حکم کا تبدیل ہونا نسخ شمار نہیں ہوگا چونکہ ہر موضوع کا اپنا اپنا حکم ہوتا ہے جو موضوع کے بدلنے سے بدل جاتا ہے۔

۳۔ناسخ ومنسوخ کے درمیان اس طرح تصادم اور ٹکراؤ کا پایا جانا کہ دونوں یکجا جمع نہ ہو سکتے ہوں، لیکن اگر الگ الگ ہوں مگر بیک وقت جمع ہو سکتے ہوں تو نسخ کا اطلاق نہ ہوگا۔

۴۔منسوخ ہونے والے حکم کی مدت پہلے ہی سے کسی خاص وقت کے لئے متعین نہ ہو چونکہ منسوخ اور سابق حکم اس صورت میں معینہ مدت ختم ہو جانے کے بعد خود بخود بے اثر ہو جائے گا، الگ سے نسخ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

نسخ کی اہمیت

نسخ کی اہمیت بالکل واضح اور روشن ہے۔وہ فقیہ جو قرآن مجید سے فقہی احکام کا استنباط کرنا چاہتا ہے یا وہ علم کلام کا ماہر (متکلم) جو معارف قرآنی کو دریافت کرنا چاہے، ان سب کے لئے لازم ہے کہ منسوخ آیات کی پہچان کریں تا کہ فتویٰ یا فیصلہ کے موقع پر ان آیتوں سے استناد نہ کریں۔

ابوعبدالرحمن سلمی کہتے ہیں کہ کوفہ کے ایک قاضی سے ملاقات کے موقع پر حضرت علیؑ نے پوچھا: ''کیا تم ناسخ ومنسوخ کی معرفت رکھتے ہو؟'' قاضی نے کہا: ''نہیں۔'' تو آپ نے فرمایا کہ پھر تم نے خود کو اور دوسروں کو ہلاک کر دیا۔ تفسیر عیاشی، ج/۱، ص/۲۱، ح/۹

نسخ کی حقیقت

اب تک کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سابق حکم کو بعد میں آنے والے حکم کے ذریعہ بدل دینے کو نسخ کہتے ہیں۔یہ تبدیلی عموماً نظر ثانی کا پتہ دیتی ہے۔یعنی شارع نے گذشتہ حکم ظاہراً ہمیشہ کے لئے صادر فرمایا تھا، لیکن اب موجودہ حالت کے پیش نظر اس حکم پر نظر ثانی کر کے موجودہ حالت کے تقاضے کے مطابق نیا حکم صادر فرمایا۔یہ نظر ثانی آئندہ کے واقعات سے لاعلمی کا ثبوت دیتی ہے جو خدا کے علم ازلی سے مطابق (نہیں ہوتا۔وہ علم جو ہر شے کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔) انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں اس قسم کا نسخ ایک فطری بات ہے کیونکہ انسان آئندہ ہونے

والے سارے واقعات کی پیشین گوئی کرنے سے بہر حال قاصر ہے، لیکن نسخ کی یہ قسم (نسخ حقیقی) یعنی نظر ثانی قوانین الٰہیہ کے سلسلے میں خلاف عقل ہے۔

اس بنا پر الٰہی شریعتوں میں نسخ، نسخ حقیقی نہیں بلکہ نسخ ظاہری ہوگا، یعنی بظاہر لوگوں کے خیال میں نسخ ہوتا ہے جبکہ واقعاً نسخ نہیں ہوتا۔خداوند متعال پہلا حکم بناتے وقت ہی جانتا تھا کہ اس حکم کی مدت محدود اور معین ہے، یہ حکم فلاں معین وقت تک رہے گا لیکن بعض مصلحتوں کے پیش نظر وہ مدت بندوں سے بیان نہیں کی تھی۔اس وضاحت کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے یہاں درحقیقت نسخ نہیں ہوتا بلکہ خدا نے پہلے والے حکم کو بغیر اس کی مدت ذکر کئے ہوئے ایک معین وقت کے لئے بنایا تھا اور پھر جدید حکم کے بعد خود بخود پہلے والے حکم کی معنویت کا اعلان بھی کر دیا۔

قرآن میں نسخ کے اقسام

قرآنی آیات میں نسخ چند صورتوں سے تصور کیا جا سکتا ہے۔ان میں سے کچھ قابل قبول اور بقیہ نا قابل قبول ہیں:۔

۱۔آیت اور مضمون آیت دونوں کا نسخ: آیت کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے الفاظ بھی قرآن مجید سے منسوخ ہو جائیں۔

۲۔فقط آیت منسوخ ہو: یعنی آیت کے الفاظ وعبارات قرآن سے نکال دیئے جائیں، مگر اس آیت میں بیان شدہ حکم باقی رہے۔

۳۔فقط آیت کا مضمون منسوخ ہو: آیت کے الفاظ پہلے کی طرح زینت قرآن بنے رہیں، ان کی تلاوت بھی کی جائے لیکن اس آیت میں بیان حکم منسوخ ہو جائے۔

۴۔نسخ مشروط: یہ وہی تیسری صورت ہے جس کا بیان صفحہ ۹۹ پر کیا جا چکا ہے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ سابق حکم جن حالات کے سبب نسخ ہوگا، ان کے دور ہونے کے بعد منسوخ حکم دوبارہ نافذ ہو جائے گا۔نتیجہ یہ نکلا کہ ناسخ ومنسوخ دونوں ہی حالات اور شرائط کی پیداوار ہیں۔

نسخ مشروط اور نسخ محتوا میں یہ فرق ہے کہ نسخ محتوا میں حکم بطور مطلق اور ہمیشہ کے لئے منسوخ ہوجاتا ہے اور دوبارہ عائد نہیں ہوسکتا، لیکن نسخ مشروط میں نسخ ہونے والے حکم حالات کے بدلنے سے دوبارہ پلٹ آتا ہے۔

ہماری نظر میں نسخ فقط تیسری اور چوتھی صورت (نسخ محتوا اور نسخ مشروط) صحیح ہے۔ قرآن کریم میں اسی قسم کی نسخ پائی جاتی ہیں لیکن پہلی والی صورت (نسخ محتوا والفاظ) اگرچہ فرض کی جاسکتی ہے لیکن قرآن مجید میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دوسری صورت یعنی (نسخ آیت) آیت کے الفاظ منسوخ ہوجائیں لیکن حکم باقی رہ جائے۔ صرف یہی نہیں کہ قرآن میں ایسا نہیں وارد ہوا ہے بلکہ ایسا ہونا بنیادی طور پر خلاف عقل بھی ہے یعنی یہ بات یقینی طور پر غیر معقول ہے کہ آیۂ کریمہ جو حکم شرعی کے لئے ثبوت اور سند ہوتی ہے، اسے منسوخ کردیا جائے لیکن اس کے محتوا کو محفوظ اور ثابت رکھا جائے۔

منسوخ آیتیں

گذشتہ علماء کے نزدیک نسخ کا مفہوم اس کے موجودہ مفہوم سے زیادہ وسیع تھا، دور ماضی میں سابقہ حکم میں ہر طرح کی ترمیم اور تبدیلی کو نسخ کہا جاتا تھا جبکہ اس وقت رائج اصطلاح میں نسخ کا مطلب ہوتا ہے کہ نئے حکم کو پرانے حکم کی جگہ پر کرنا اس طرح کہ سابقہ حکم مکمل طور پر محو اور منسوخ ہوجائے۔

ان علماء نے نسخ کی تعداد ۲۲۸ تک پہنچادی ہے جنہوں نے نسخ سے ماضی کا وسیع اور عام مفہوم مراد لیا یا ثبوت نسخ کے مقررہ اصول وضوابط کو بالائے طاق رکھ دیا۔ سیوطی نے کثرت نسخ کی تردید کرتے ہوئے منسوخ آیات کی تعداد ۲۱ بتائی ہے جب کہ آیت اللہ خوئی طاب ثراہ پورے قرآن میں فقط ایک آیت (آیت نجوی) کو منسوخ مانتے ہیں، لیکن نسخ کے مقررہ اصول وضوابط کی روشنی میں نسخ مشروط کو شامل کرتے ہوئے قرآن مجید میں ۸ مقامات پر نسخ کا ثبوت فراہم ہے اور ان ۸ جگہوں پر کل ملا کر ۱۲۰ آیتیں نسخ کے ضمن میں آئی ہیں۔ التمہید، ج/۲، ص/۳۱۷، ۱۰۲

منسوخ آیات کی چند مثالیں

آیات	منسوخ	ناسخ
آیۂ نجوی	يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً... (مجادلہ/۱۲)	أَأَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ... (مجادلہ/۱۳)
آیہ عدد مقاتلین	يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ (انفال/۶۵)	الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (انفال/۶۶)
آیہ محشاء	وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِنْكُمْ، وَاللَّذَانِ يَأْتِيَانِهَا مِنْكُمْ فَآذُوهُمَا فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا (نساء/۱۵، ۱۶)	الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (نور/۲)
آیہ توارث بوسیلہ ایمان	إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (انفال/۷۲)	...وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ... (احزاب/۶)
آیات معاہدہ	نساء ۸۹، ۹۰ و ۹۲ انفال ۷۲ ممتحنہ ۱۰ و...	سورۂ برات

آیات عفو درگذر	قُلْ لِّلَّذِیْنَ آمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (جاثیہ/۱۴) ...فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ... (بقرہ/۱۰۹)	وہ آیتیں جو کفار سے جنگ اور مقابلہ پر مشتمل ہیں۔

مثال کے طور پر دو منسوخ آیتوں کا تذکرہ یہاں پیش کر رہے ہیں۔

آیۂ نجویٰ

لوگ وقت بے وقت رسولؐ اسلام سے ملنے پہنچ جاتے تھے۔ وہ باتیں کرتے تھے جو رسولؐ کے شایان شان نہیں ہوتی تھیں یا بہت چھوٹی اور کبھی کبھی تو بیہودہ پن کی باتیں بھی آپ سے پوچھتے تھے۔ اس سے رسول اللہ سخت آزردہ خاطر تھے مگر رحمۃ اللعالمین ہونے کے سبب برداشت کرتے رہے۔ کریم پروردگار نے غیر ضروری ملاقاتوں اور سوالوں میں کمی کرنے اور غریب مسلمانوں کی مالی اعتبار سے مدد کرنے کے لئے آیت نازل کردی:

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰاکُمْ صَدَقَۃً ذٰلِکَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَاَطْھَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"

"ایمان والو جب بھی رسول سے کوئی راز کی بات کرو تو پہلے صدقہ نکال دو کہ یہی تمہارے حق میں بہتری اور پاکیزگی کی بات ہے پھر اگر صدقہ ممکن نہ ہو تو خدا بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (مجادلہ/۱۲)

اس حکم کے بعد لوگوں نے پیغمبرؐ اسلام کے پاس آنا جانا کچھ پوچھنا یا آپ سے باتیں کرنا بالکل بند کردیا۔ صرف مولائے کائنات حضرت علیؑ کی ذات والا صفات تھی جس نے ایک دینار کو دس درہم میں بیچا اور دس دنوں تک ہر روز ایک ایک درہم صدقہ دے کر رسولؐ اللہ سے ملاقات کی اور علوم و معارف کا اکتساب کیا، یہاں تک کہ مندرجہ ذیل آیت کے ذریعہ صدقہ دینے کا حکم منسوخ ہوگیا:

"ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰاکُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ"

"کیا تم اس بات سے ڈر گئے ہو کہ اپنی راز دارانہ باتوں سے پہلے خیرات نکال دو۔ اب جب کہ تم نے ایسا نہیں کیا ہے اور خدا نے تمہاری توبہ قبول کرلی ہے تو اب نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ و رسول کی اطاعت کرو کہ اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔" (مجادلہ/۱۳)

واضح رہے کہ اس آیت کا مضمون منسوخ ہوگیا ہے چونکہ سابق حکم یعنی ہر سوال یا ملاقات سے پہلے صدقہ دینے کا وجوب زائل ہوگیا کیونکہ یہ جدید حکم یعنی نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، سابق حکم کے بجائے آگیا ہے۔

آیات عفو و درگذر

صدر اسلام کے مسلمانوں کو حکم ملا کہ مشرکین کی ایذاء رسانیوں پر صبر و تحمل سے کام لیں کیونکہ مکہ میں مسلمانوں کی حالت کمزور تھی اور مقابلہ کی صورت میں ان کی بربادی اور خاتمہ کا خطرہ تھا۔ اس لئے سورۂ 'جاثیہ' میں ارشاد ہوا:

"قُلْ لِّلَّذِیْنَ آمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ ..."

"آپ صاحبان ایمان سے کہہ دیں کہ وہ خدائی دنوں کی توقع نہ رکھنے والوں سے درگذر کریں۔"

ایام اللہ سے مراد قیامت کے دردناک عذاب اور سخت سزائیں ہیں۔ مسلمان اسی طرح صبر و تحمل کرتے رہے لیکن جب اللہ کے فضل و کرم سے اسلامی معاشرے کو طاقت و قدرت اور شان و شوکت مل گئی تو اب کفار سے مقابلہ کی اجازت مسلمانوں کو دے دی گئی:۔

"اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ"

"جن لوگوں سے مسلسل جنگ کی جارہی ہے انہیں ان کی مظلومیت کی بنا پر جہاد کی

اجازت دے دی گئی ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

بعض دوسری آیتوں میں مقابلہ کا حکم یوں دیا گیا: "حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ..."

"مومنین کو جہاد کے لئے آمادہ کیجئے۔" (بقرہ/۱۹۴)

"فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ..." (بقرہ/۱۹۴)

شہر حرام کا جواب شہر حرام ہے اور حرمات کا بھی قصاص ہے لہٰذا جو تم پر زیادتی کرے تم ویسا ہی برتاؤ کرو جیسی زیادتی اس نے کی ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ سمجھ لو کہ خدا پرہیزگاروں ہی کے ساتھ ہے۔

"فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ"

"کفار کو قتل کر دو جہاں پاؤ۔" (توبہ/۵)

واضح رہے کہ یہ تمام آیتیں مدنی سوروں کی ہیں۔ یہ عفو اور درگذر سے متعلق نسخ مشروط کا بہترین ثبوت ہیں۔ چونکہ یہ آیتیں کچھ خاص مقامات اور خاص حالات میں منسوخ ہوئی ہیں یعنی جب تک مسلمان طاقتور اور دشمن سے مقابلہ کی صلاحیت رکھتے ہیں ورنہ سابق حالات اگر پلٹ جائیں تو عفو و درگذر کی آیتیں پھر سے عائد ہو جائیں گی اور ان کے مطابق عمل کرنا مسلمان پر واجب ہو جائے گا۔

سوالات

۱۔ نسخ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے شرائط بیان کیجئے۔

۲۔ کیا پیغمبر اسلام کے بعد بھی نسخ ہو سکتا ہے؟ سبب بھی بیان کیجئے۔

۳۔ قرآن مجید میں موجود نسخ آیتوں کے کوئی تین فائدے بیان کیجئے۔

۴۔ نسخ حقیقی اور نسخ ظاہری کی وضاحت کرتے ہوئے بتایئے کہ الٰہی شریعتوں میں کون سا نسخ ہوتا ہے اور کیوں؟

۵۔ قرآن میں نسخ کتنی طرح سے پایا جاتا ہے؟ ہر ایک کی تعریف لکھئے۔

۶۔ نسخ مشروط اور نسخ محتوی کا فرق بتایئے۔

۷۔ کسی موقع کی منسوخ آیت اس کی ناسخ آیت کے ساتھ لکھئے۔ موقع کی مختصر وضاحت بھی کیجئے۔

چودھواں سبق

محکم و متشابہ

متشابہ کے مقابلہ میں استعمال ہونے والا لفظ محکم ''حکم حکماً'' سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی ہیں ''منع منعاً'' ہر طرح کی خلل اندازی اور تباہی و بربادی سے روکنا اور بچانا۔ راغب اصفہانی کے بقول دراصل ''حکم'' کے معنی ہوتے ہیں اصلاح کے لئے کسی چیز سے روکنا۔ عربی زبان میں گھوڑے کی لگام کو ''حکمۃ الفرس'' کہتے ہیں کیونکہ لگام گھوڑے کو سرکشی سے باز رکھتی ہے۔

''حکم'' دراصل اصلاح کے لئے روکنے اور باز رکھنے کے معنی میں ہے لہٰذا ہر وہ کلام جو واضح اور شک وشبہہ سے محفوظ ہو اسے ''محکم'' کہتے ہیں یعنی وہ کلام محکم ہے جو نقص وعیب سے دور اور مستحکم ہو۔ تشابہ یا تو ''شبہ'' یعنی اسم مصدر سے لیا گیا ہے مثل اور مانند کے معنی میں یا ''شَبَہ'' یعنی مصدر سے ماخوذ ہے مثل اور مانند ہونے کے معنی میں کہ یہی ہم مثل اور مشابہ ہونا حق و باطل کے درمیان اشتباہ اور غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔

اصطلاحاً اس کلام کو متشابہ کہتے ہیں جو مبہم ہو، سمجھ میں نہ آئے اور مخاطب کو شک وشبہہ میں ڈال دے کیونکہ کلام کا ظاہر اپنی واقعی مراد کو سمجھانے سے قاصر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے کلام سے لوگ حیرانی و سرگردانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں متشابہات

سورۂ آل عمران کی ساتویں آیت نے قرآن مجید کی ساری آیتوں کو دو حصوں (محکمات و متشابہات) میں تقسیم کر دیا ہے:۔

"هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ

وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ"

''اس نے آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جس میں سے کچھ آیتیں محکم اور واضح ہیں جو اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں اب جن کے دلوں میں کجی ہے وہ انہیں متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور من مانی تاویلیں کریں۔''

قرآن مجید کی اکثر و بیشتر آیتیں محکم ہیں۔ محکم آیات واضح، بولتی ہوئیں اور ہر طرح کے شک وشبہہ سے محفوظ ہیں اور چونکہ ان آیتوں کے سلسلہ میں کوئی مغالطہ نہیں ہوتا اور غلط استفادہ نہیں کر پاتا لہٰذا ان آیات کو محکم اور مستحکم کہا جاتا ہے۔

محکم آیات کے علاوہ قرآن کریم میں کچھ ایسی آیتیں بھی ہیں جن کا واقعی مراد بعض وجوہات کی بنا پر مبہم اور سمجھ میں نہ آنے والا ہے، جسے آیت کے ظاہری عبارت کے ذریعہ سمجھا نہیں جا سکتا اور آخر کار یہی ابہام اور نارسائی طرح طرح کے نظریات اور شک وشبہہ کا سبب بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی غرض رکھنے والے (مفاد پرست) اور فتنہ پرور عناصر انہی آیات کو سہارا بنا کر دین میں نت نئی باتیں اور بدعتیں پیدا کر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس قسم کی آیات کو متشابہ کہا جاتا ہے۔

راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ متشابہات قرآن سے مراد وہ آیتیں ہیں جن کی تفسیر مشکل ہے کیونکہ اس طرح کی آیتوں کا مفہوم واضح نہیں ہوتا، وہ کسی دوسری چیز سے مشابہت رکھتی ہیں اور ظاہر ہے وہ دوسری چیز سوائے ضلالت اور گمراہی کے کچھ نہیں۔

"فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ"

''حق کے بعد گمراہی کے علاوہ پھر کیا بچتا ہے۔'' (یونس/۳۲)

اس تعریف کی رو سے قرآن کریم میں پایا جانے والا تشابہ حق و باطل کے درمیان تشابہ ہے اور قرآن مجید کی ہر وہ آیت جو عین حق ہوتے ہوئے بھی باطل سے مشابہت رکھتی ہو جس سے سہواً یا عمداً غلط اور باطل مفہوم نکالنے کا امکان پایا جائے اسے متشابہ کہتے ہیں۔

قرآن میں متشابہات کے اقسام

لفظ ومضمون کے اعتبار سے قرآن میں آیۂ متشابہات کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ متشابۂ اصلی: متشابۂ اصلی وہ متشابہ ہے جو فطری طور پر یعنی الفاظ کی کمی اور معانی ومطالب کی وسعت کے سبب پیدا ہوتا ہے یعنی ایک طرف تو عربی زبان کے الفاظ وکلمات معمولی، سطحی اور عام مفاہیم کو سمجھانے کے لئے وضع کئے گئے ان کے سہارے وسیع مطالب اور گہرے معنوں تک رسائی ناممکن سی ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید کو بہر حال انہی الفاظ وکلمات کے سہارے اپنے معارف و معالم بندوں تک پہنچانا تھا۔ "اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ"

"بیشک ہم نے اسے عربی قرآن قرار دیا ہے تا کہ تم سمجھ سکو۔" (زخرف/۳)

لہٰذا ان بڑے مطالب اور ان گہرے اور سخت معنوں کو سمجھانے کے لئے قرآن کریم کو کنایہ، مجاز اور استعارہ وغیرہ کو استعمال کرنا پڑا اور یہ چیزیں خود عربوں کے لئے بھی اجنبی، سخت اور نامانوس تھیں۔ (یہ اور بات ہے کہ نہایت دلچسپ بھی ہیں۔)

ابتدائے آفرینش اور قیامت، انسان کے جبر واختیار، عالم ہستی میں انسان کے تصرفات کی حدیں، خلقت اور واجب وحرام ہونے وغیرہ کے اسباب پر مشتمل آیتیں عموماً مندرجہ بالا آیتوں کی فہرست میں آتی ہیں کیونکہ معانی بہت گہرے اور وسیع ہیں لیکن الفاظ (ان مطالب کو ادا کرنے میں) کمزور ان تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ اس قسم کی متشابہ آیات کی تعداد کل قرآن کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ محکم آیتیں جو "ام الکتاب" ہیں نیز احادیث رسولؐ وآل رسولؐ اور بزرگان دین کے اقوال کا سہارا لے کر ان متشابہ آیتوں کے مفاہیم بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

متشابۂ عرضی

یہ متشابہ نظریات وعقائد کے اختلافات اور افکار ومذاہب کے تصادم کے نتیجہ میں ہوتا

ہے۔ آغاز اسلام میں یہ آیتیں متشابہ شمار نہیں ہوتی تھیں اور اسلامی سماج فکر ونظر کی سلامتی اور خلوص نیت کے ساتھ ان کی تلاوت کرتا تھا اور اچھی طرح معنی ومفاہیم بھی سمجھ لیتا تھا لیکن بعد میں مناظرہ اور کلامی مسائل کے رواج نے اور خصوصاً یونان کے اڑتے اڑاتے ادھورے اور ناپختہ فلسفیانہ نظریات نے آکر اسلامی معاشرہ کے صاف ستھرے ماحول کو مکدر کر دیا۔ نتیجہ میں بہت سی آیتوں کے نمایاں چہرے بھی دھندلا گئے۔ افکار ونظریات کے تصادم میں ہر فرقہ کا سارا زور اسی پر ہوتا تھا کہ جیسے بھی ہو، اپنے مکتب خیال اور نظریہ کی حقانیت قرآن سے ثابت کر دے اور عام پسند دستاویز اور تائید اپنے مدعا کے لئے حاصل ہو جائے۔

انہی اسباب کی بنا پر وہ آیتیں جو اب تک محکمات کے زمرے میں آتی تھیں، اب متشابہات کی فہرست میں آگئیں۔

زیادہ تر قرآن مجید کے متشابہات عرضی ہیں۔ آج جو آیتیں متشابہ کے نام سے مشہور ہیں ان کی اکثریت کا تعلق اسی قسم سے ہے۔

تفسیر میں متشابہ ومحکم

محکم اور متشابہ کے بارے میں بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں جن میں سے زیادہ تر تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ بعض تعریفوں میں متشابہات کے مصداق معین کر دیئے گئے ہیں، جبکہ بعض میں متشابہات کو مبہمات سے خلط ملط کر دیا گیا ہے۔

علامہ طباطبائیؒ نے اپنی تفسیر میں متشابہات کی تعریف میں سولہ وجہیں بیان فرمائی ہیں اور کچھ علماء نے اس سے بھی زیادہ۔ آگے کچھ وجہیں ملاحظہ ہوں:۔

(الف) منسوخ آیات متشابہات اور ناسخ آیات محکمات ہیں۔

(ب) احکام والی آیات محکمات اور بقیہ متشابہات ہیں۔

(ج) محکم کے برخلاف متشابہ عقل کی پہنچ سے باہر ہے۔

(د) محکم کے برخلاف متشابہ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔

(ہ) متشابہ کا مفہوم سخت اور پیچیدہ ہوتا ہے جبکہ محکم کا مفہوم واضح اور روشن ہوتا ہے۔

(و) متشابہ مجمل اور غیر واضح ہوتا ہے۔

(ز) گذشتہ انبیاء اور امتوں کی سرگذشت سے متعلق آیتیں محکمات ہیں اور انہیں آیات میں سے جن میں ابہام پایا جاتا ہے وہ متشابہات ہیں۔ (علوم قرآنی، ص/۲۸۵۔۲۸۱)

متشابہ ہونے کے اسباب

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ متشابہ ہونے کے دو اسباب ہیں:۔

۱۔ اصلی ۲۔ عرضی

کبھی تو تشابہ (متشابہ ہونا) معانی کی بلندی، مفاہیم کی وسعت اور دوسری طرف الفاظ کی تنگی اور محدودیت کے سبب ہوتا ہے۔ اس طرح کا تشابہ اصلی اور فطری ہے اور کبھی تشابہ حقیقت میں ہوتا ہی نہیں بلکہ افکار و نظریات کے تصادم کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جسے تشابہ عرضی کہتے ہیں۔

تفسیر و تاویل

ہمارے لئے محکم و متشابہ پر آیت میں تھوڑا بہت ابہام ہوتا ہے۔ البتہ متشابہات کو پڑھنے کے بعد ذہن میں شبہہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا ہر متشابہ مفہوم کو سمجھنے کے لئے ہمیں دو کام کرنے ہوں گے: پہلے ابہام دور کرنا ہوگا بعد میں شبہہ کا ازالہ کرنا ہوگا ابہامات کی وضاحت کو (جو محکم و متشابہ دونوں طرح کی آیتوں میں ہوتے ہیں۔) ''تفسیر'' کہتے ہیں اور صرف متشابہات میں موجود شبہات کے ازالہ کو ''تاویل'' کہتے ہیں۔

تفسیر کی تعریف میں کہا گیا ہے ''مشکل الفاظ کے چہرے سے نقاب ہٹانا'' جب الفاظ

ابہام آلود ہوں معنی پر پردہ پڑا ہو تو مفسر علم و عقل کے سہارے تہہ بہ تہہ جمی ہوئی ابہام کی گرد صاف کر دیتا ہے۔

تاویل مادہ ''اول'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی رجوع اور بازگشت کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا تاویل کا لغوی مطلب ہوگا رجوع دینا۔ لفظ تاویل کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کوئی بات شک و شبہہ اور حیرت و پریشانی کا سبب ہو رہی ہو اور کوئی عقلمند انسان اسی بات کا معقول اور صحیح حل بتادے جس سے حیرت و اضطراب کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اس سوجھ بوجھ اور سمجھ والے اقدام کو تاویل کہتے ہیں۔

جناب موسیٰ کے ساتھی نے جب آپ کو حیرت و تعجب میں دیکھا تو بشارت دی کہ عنقریب تمہاری نظر میں اپنے عجیب و غریب کاموں کی حکمت اور صحیح صحیح تاویل بیان کردوں گا۔

''...سَاُنَبِّئُکَ بِتَاوِیْلِ مَالَمْ تَسْتَطِعْ عَلَیْهِ صَبْرًا''

''میں تمہیں ان تمام باتوں کی تاویل بتادوں گا جن پر تم صبر نہیں کر سکے۔'' (کہف/۷۸)

اس وضاحت کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ متشابہات کو سمجھنے کے لئے تفسیر کے علاوہ تاویل کی ضرورت بھی درپیش ہوتی ہے۔ تفسیر سے ابہام اور تاویل سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوتا ہے۔ لیکن آیات محکمہ کے لئے صرف تفسیر کی ضرورت ہوتی ہے، تاویل کی نہیں۔ تاویل تفسیر کی بہ نسبت اخص مطلق ہے۔ یعنی جہاں تفسیر ہوگی ضروری نہیں کہ تاویل بھی ہو، لیکن جہاں تاویل ہوگی وہاں ہر حال میں تفسیر بھی ہوگی کیونکہ تاویل خود ایک قسم کی تفسیر ہے۔

متشابہات کی تاویل کون جانتا ہے؟

سورۂ آل عمران کی ساتویں آیت میں محکم و متشابہ کی تقسیم کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

''...وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ''

''حالانکہ اس کی تاویل کا علم صرف خدا کو ہے اور انہیں جو علم میں رسوخ رکھنے والے ہیں جن کا کہنا یہ ہے کہ ہم اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ سب کی سب محکم و متشابہ ہمارے پروردگار ہی کی طرف سے ہے اور یہ بات سوائے صاحبان عقل کے کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔''

اس آیہ کریمہ کی رو سے متشابہ کے راز و رموز تک خدا کے علاوہ حقیقی علم رکھنے والے علماء بھی دسترس رکھتے ہیں۔ حقیقی علماء ان آیات کو سمجھنے کے لئے الٰہی راستے پر گامزن ہیں اور ان کا شعار ہے کہ محکم و متشابہ ساری آیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ ظاہری پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے حقائق کا سراغ لگانا عقلمندی کی پہچان ہے۔

قرآن کے مخفی حقائق یعنی معارف الٰہی کے خزانوں تک دسترس کا راستہ بند ہو نہیں سکتا کیونکہ اس صورت میں قرآن مجید میں موجود بہت سی آیتیں مسلمانان عالم، علماء اسلام حتی کہ ائمہؑ اور پیغمبر اسلامؐ کے لئے بھی سوجھ بوجھ کے دائرے سے باہر ہو جائے گی۔ اور ایسی صورت میں حکمت الٰہی پر آنچ آئے گی کہ وہ کتاب جو ہمیشہ کے لئے بشری ہدایت کی ذمہ دار ہے اس میں کچھ باتیں اتنی زیادہ مبہم ہیں کہ انہیں رسول بھی نہیں سمجھ پا رہے ہیں یہ فرض کرنا یقیناً محال ہے اور حکمت الٰہی سے بعید ہے۔ پس معلوم ہوا کہ آیات متشابہ کے چھپے ہوئے حقائق اور معانی تک خاصان خدا کی رسائی ہو سکتی ہے: "یقولون آمنا بہ" یہ جملہ جملۂ حالیہ ہے اور ایمان کی پختگی ظاہر کرتا ہے۔ ایمان کی یہی استقامت اور پائیداری اس بات کا سبب قرار پائی ہے کہ خاصان خدا الٰہی اسرار و رموز پر نظر رکھیں اور آیات متشابہ کے پیچھے چھپے ہوئے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ علم و حکمت کے ماحول میں پلے بڑھے ہیں، لہٰذا آیات متشابہ بھی وہیں سے نازل ہوئی ہیں جہاں سے آیات محکمہ کا نزول ہوا ہے اور آیات متشابہ کو پڑھنے کے بعد یہ سوچتے ہیں کہ اس آیت میں ظاہر سے ہٹ کر پس پردہ بھی کچھ حقائق پوشیدہ ہیں اور اسی تفکر کے نتیجہ میں آیات متشابہ کی تاویل کا ادراک کر لیتے ہیں۔

متشابہ آیات کی کچھ مثالیں

ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ متشابہ کی دو قسمیں ہیں: اصلی اور عرضی لہٰذا دونوں قسموں سے ایک ایک مثال پیش کر رہے ہیں۔ (التمہید، ج/۳، علوم قرآنی، ص/۳۱۷۔۲۹۴)

۱۔ تحیز کی نفی: ''تحیز'' سے مراد ہے جگہ گھیرنا اور کسی خاص سمت میں ہونا (داہنے بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے) یہ چیز مادیات کی خصوصیات میں سے ہے اور جسمانیات کا لازمہ ہے۔

تحیز یعنی مکانی ہونا خدا کی ذات میں نہیں پایا جاتا کیونکہ خدا مادہ سے مبرا اور منزہ ہے۔ نتیجتاً تمام مادی اور جسمانی اوصاف سے بھی پاک و پاکیزہ ہے۔

اشاعرہ فرقہ کا رئیس ابوالحسن اشعری تحیز اور خدا کے مکانی ہونے کا قائل ہے۔ اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے اس نے قرآن مجید کے ان شواہد کا سہارا لیا ہے۔

(التمہید، ج/۳، ص/۱۱۱۔۱۱۵، الابانہ، ص/۲۶۔۲۸)

"اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" (طٰہٰ/۵)

''وہ رحمان عرش پر اختیار و اقتدار رکھنے والا ہے۔''

"یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ..." (سجدہ/۵)

''وہ خدا آسمان سے زمین تک کے امور کی تدبیر کرتا ہے پھر یہ امر اس کی بارگاہ میں پیش ہوگا۔

"یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ..." (نحل/۵۰)

مذہب امامیہ اور معتزلہ اس محکم آیہ کریمہ کے مدنظر کہ "لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ"

''اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔'' شوریٰ/۱۱

خدائے سبحان کو مخلوقات سے کسی بھی صورت سے مشابہ ہونے سے مبرا اور پاک مانتے ہیں۔ اور مذکورہ آیتوں کی تاویل کرتے ہیں جنہیں اشعری اور اس کی جماعت نے متشابہ بنا دیا ہے یعنی خدا کی منزل اگر قابل تصور ہو تو وہ ایک ایسے عالم میں ہے، جو اس عالم خاکی سے برتر ہے، جہاں سے

عالم خاکی کے باشندوں پر خیرات و برکات کا نزول ہوتا ہے، بندوں کے اعمال صالحہ بھی اس کی طرف صعود کرتے ہیں یعنی بلند ہوتے ہیں ورنہ ایسا نہیں ہے کہ خدا کسی خاص سمت میں ہے اور بقیہ دوسری سمتوں میں نہیں ہے۔ "فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"

"لہٰذا تم جس جگہ بھی قبلہ کا رخ کرلو گے سمجھو وہیں خدا موجود ہے۔" (بقرہ/۱۱۵)

اپنے نظریہ کے ثبوت میں اشاعرہ نے جن آیتوں کو پیش کیا ہے، درحقیقت ان کا شمار آیات محکمہ میں ہوتا تھا اور نزول کے زمانہ کے مسلمان اپنے ذوق کی سلامتی اور فکر کی پاکیزگی کے سبب ان آیتوں میں اشارۃً اور کنایۃً بیان کئے گئے مفاہیم کو سمجھ لیتے تھے لیکن بعد میں اشاعرہ نے اپنے مذہب کی تقویت کے لئے اپنی من مانی تفسیر کر کے ان آیات کو متشابہ بنا دیا لہٰذا اس قسم کی آیتوں میں تشابہ اصلی نہیں عرضی ہوگا۔ (علوم قرآنی، ۳۰۳۔۲۹۹، التمہید، ج/۳، ص/۱۲۶)

۲۔ارادہ واختیار: اس سے پہلے متشابہ اصلی کی تعریف میں بتایا جا چکا ہے کہ اصل وجہ معانی کی بلندی اور الفاظ کی کوتاہی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات اس قسم کی متشابہ ہیں:۔

"...وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى..."

اور پیغمبر آپ نے سنگریزے نہیں پھینکے ہیں بلکہ خدا نے پھینکے ہیں...۔" (انفال/۱۷)

اس دور کا عرب معاشرہ اس آیت سے جبر کا مفہوم سمجھ رہا تھا جبکہ اس آیت کے ذریعہ یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ انسان کے اختیاری کاموں میں بھی دوسرے عوامل کی بہ نسبت انسان کی اپنی طاقت نہیں کے برابر ہی مداخلت کرتی ہے کیونکہ درحقیقت تمام افعال اذن الٰہی سے انجام پاتے ہیں اس مطلب کو سمجھنا عہد رسالت کے مسلمانوں کے لئے بھی کافی دشوار تھا لہٰذا یہ آیت متشابہ اصلی قرار پائے گی۔

سوالات

۱۔ محکم و متشابہ کی اصطلاحی تعریف بیان کیجئے۔

۲۔ آیات متشابہ سے کیا مراد ہیں؟

۳۔ قرآن میں کتنی طرح کی تشابہ پائی جاتی ہیں اور کیوں؟

۴۔ تفسیر اور تاویل میں کیا فرق ہے؟

۵۔ وضاحت کیجئے کہ علم تاویل صرف خدا ہی سے مخصوص کیوں نہیں رہ سکتا؟

۶۔ متشابہات کی تاویل کا علم خدا کے علاوہ اور کن لوگوں کے پاس ہے؟

۷۔ آیات متشابہ کی کوئی مثال تفصیل سے بیان کیجئے۔

پندرہواں سبق

حروف مقطعات

علوم قرآن کی بحثوں میں ایک بحث کا تعلق حروف مقطعات سے ہے۔ قرآن کے ۲۹ سوروں کی شروعات حروف مقطعات سے ہوتی ہے۔ یہ حروف مقطعات ایک یا چند حروف تہجی پر مشتمل ہیں قرآن مجید کے سارے حروف مقطعات کی مجموعی تعداد ۷۸ حروف پر مشتمل ہے لیکن مکرر حروف ہٹا دینے کے بعد ان کی کل تعداد چودہ ہوتی ہے۔ (یعنی عربی الفابٹ کی نصف تعداد) ان حروف کو حروف مقطعات کہتے ہیں کیونکہ یہ اپنے میں اسرار و معنویت کی بڑی عظمت رکھتے ہیں۔

یہ حروف کتابت کے وقت ملا کر اور ایک ساتھ لکھے جاتے ہیں لیکن تلاوت کے وقت الگ الگ پڑھے جاتے ہیں یعنی ہر حرف کو اس کے عربی نام کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے مثلاً "المص" کو یوں پڑھا جاتا ہے "الف ، لام، میم ، صاد"

حروف مقطعات کے طور پر استعمال ہونے والے چودہ حروف یہ ہیں:

ا، ح، ر، س، ص، ط، ع، ق، ک، ل، م، ن، ہ، ی۔

بدرالدین زرکشی نے ان حروف کو ترکیب دے کر یہ جملہ بنایا" نص حکیم قاطع له سر" اور فیض کاشانیؒ نے ان حروف کو اس خوبصورت جملے کی شکل میں یکجا کیا ہے صِرَاطٌ عَلَيَّ حَقٌّ نُمْسِكُهُ"

جن سوروں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوا ہے، ان کے نام ذیل کے چارٹ میں درج کئے جا رہے ہیں:۔

سورے	حروف مقطعات	سورے	حروف مقطعات	سورے	حروف مقطعات
بقرہ	الم	حج	الر	لقمان	الم
آل عمران	الم	مریم ۔	کھیٰعص	سجدہ	الم
اعراف	المص	طٰہٰ	طٰہٰ	یٰس	یٰس
یونس	الر	شعراء	طٰسم	ص	ص
ہود	الر	نمل	طٰس	غافر	حٰم
یوسف	الر	قصص	طٰسم	فصلت	حٰم
رعد	المر	عنکبوت	الم	شوریٰ	حٰم عسق
ابراھیم	الر	روم	الم	زخرف	حٰم
دخان	حٰم	احقاف	حٰم	قلم	ن
جاثیہ	حٰم	ق	ق	.....	.....

حروف مقطعات کے بارے میں اختلاف رائے

حروف مقطعات کے بارے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں اور طرح طرح کے اقوال و نظریات پیش کئے گئے ہیں جن کی تعداد شاید ۲۰ سے بھی زائد ہو۔ (فخر رازی نے اپنی تفسیر میں ان مختلف نظریات کو جمع کیا ہے۔) لیکن مجموعی اور بنیادی طور پر ان نظریات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں اور ان کا علم خدا کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے۔ علماء اسلام اور اہل کلام نے اس نظریہ کی تردید کی ہے اور قرآن مجید میں ایسی کسی بھی بات کا انکار کیا ہے جسے پیغمبر اسلامؐ اور اولیاء خدا بھی نہ جانتے ہوں، اس لئے کہ جس کتاب کی صفت ہی "مبین"

یعنی واضح اور آشکار ہو، بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ اسی کتاب میں کچھ باتیں بالکل مخفی اور مطلقاً غیر واضح ہوں؟

۲۔ حروف مقطعات خدا اور رسولؐ کے درمیان راز ہیں جنہیں خدا کے مقرب اولیاء کے علاوہ کوئی نہیں جانتا "لایمسه الاالمطهرون" "پاک و پاکیزہ لوگوں کے علاوہ اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ (واقعہ/۷۹)

عرفانی ذوق رکھنے والوں کی کہاوت ہے "اشارے اور کنائے میں بات کرنا دوستوں کا شیوہ ہوتا ہے تاکہ محبوب آگاہ ہوجائے اور رقیب بیگانہ رہ جائے۔"

سید رضی الدین ابن طاؤس (متوفی ۶۶۴ھ) ابوعبدالرحمن محمد بن الحسین سلمی (متوفی ۴۱۲ھ) کی کتاب حقائق التفسیر سے امام جعفر صادقؑ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ کا ارشاد گرامی ہے: "خدا نے الٓمٓ کو اپنے اور اپنے رسول کے درمیان رمز اور اشارے کے طور پر رکھا ہے تاکہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا اسے نہ سمجھ سکے۔ اس رمز کو حروف کی شکل میں رکھا تاکہ رسولؐ کے لئے آشکار ہو، مگر دوسروں کے لئے مخفی رہے۔" (سعد السعود، مطبوعہ نجف، ص/۲۱۷)

ابن بابویہ ابوجعفر شیخ صدوقؒ (متوفی ۳۸۱ھ) فرماتے ہیں: "حروف مقطعات کی دوسری مصلحت یہ ہے کہ ان کا علم خاندان عصمت وطہارت سے مخصوص ہے تاکہ ان کے ذریعہ معجزات پیش کریں اور دلائل قائم کریں اور اگر سارے انسانوں کے لئے ان کی آگہی ممکن ہو جاتی تو مصلحت فوت ہوجاتی ہے۔ (کمال الدین، ج/۲، ص/۶۴۰)

اکثر و بیشتر اہل نظر کی یہی رائے ہے کہ حروف مقطعات رمز و اشارات ہیں جن کو مقرب اولیاء خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اس طرح رمز اور اشارے میں بات کرنا عربوں کا دستور بھی تھا۔ (العقیدہ، ج/۵، ص/۳۱۵۔۳۱۰، المیزان، ج/۱۸، ص/۹)

۳۔ حروف مقطعات صرف آواز ایجاد کرنے کا کام کرتے ہیں، یہ نہ رمز و اشارہ ہیں اور نہ ہی بامعنی۔ بعض سوروں کے شروع میں ان حروف کے رکھے جانے کا فلسفہ الفاظ اور آواز کے دائرے تک ہی محدود ہے۔

کچھ کا نظریہ یہ ہے کہ نصف حروف تہجی عربوں سے یہ کہنے کے لئے لائے گئے کہ اگر تمہارا یہ کہنا سچ ہے کہ یہ بشر کا کلام ہے اور انہی حروف تہجی سے تشکیل پایا ہے، تو تم دیگر نصف حروف تہجی کا اضافہ کر کے اس طرح کا کلام پیش کرو۔

بعض افراد کا کہنا ہے کہ ایسے میں تلاوت قرآن کے وقت یہ آوازیں حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنتی تھیں تاکہ لوگ قرآن مجید کو سنیں کیونکہ پیغمبر اسلامؐ کی مخالف جماعت تلاوت قرآن کے وقت شور شرابہ اور ہلڑ ہنگامہ کیا کرتی تھی تاکہ راستہ چلنے والے عربوں تک قرآن کی آواز نہ پہنچ سکے۔ "لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ" فصلت/۲۶)

بعض علماء کا خیال ہے کہ زیتون، انجیر شہر مکہ وغیرہ کی طرح اللہ نے ان حروف کے ذریعہ بھی قسم کھائی ہے اور حروف کے ذریعہ قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان میں کلام کی بنیاد حروف ہی پر رکھی جاتی ہے۔

علامہ طباطبائیؒ سورۂ شوریٰ کی تفسیر کرتے ہوئے ان حروف کے بارے میں فرماتے ہیں: "جو سورے حروف مقطعات سے شروع ہوتے ہیں ان میں غور و فکر کرنے کے بعد نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مضمون اور مطالب کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور ان کے سیاق و سباق ایک ہی جیسے ہیں لہٰذا یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان حروف اور ان سوروں کے درمیان ہوسکتا ہے کوئی رابطہ پایا جاتا ہو، مثلاً سورۂ اعراف جس کی ابتدا 'المص' سے ہوئی شاید 'الم' اور 'ص' سے شروع ہونے والے سوروں کے مضمون و مطالب پر محیط اور جامع ہو۔ اسی طرح سورۂ رعد جس کا آغاز 'المر' سے ہوا ہے شاید 'الم' اور 'الر' سے شروع ہونے والے سوروں کے مطالب کو اپنے اندر جمع کئے ہو۔ کل ملا کے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ حروف ہمارے اور خدا کے درمیان رمز و اشارہ ہوں جو ہم سے پوشیدہ ہیں۔ مذکورہ ارتباط کے علاوہ ان حروف سے ہم کچھ نہیں سمجھتے۔ شاید آئندہ زمانے کے لوگ مزید بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ امیر المومنینؑ نے اپنے اس بیان میں شاید اسی بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہر کتاب میں کچھ منتخب مطالب

ہوتے ہیں۔قرآن کے برگزیدہ مطالب حروف مقطعات ہیں۔ (المیزان، ج/۱۸،ص/۶)

اس سلسلے میں ہم بھی اس نظریہ کو مانتے ہیں جس میں حروف مقطعات کو رمز و اشارہ کہا گیا ہے کیونکہ یہ حروف کچھ ایسے اسرار و رموز پر مشتمل ہیں جو خدا، رسولؐ، ائمہ اہلبیتؑ سے مخصوص ہیں اگر دوسرے لوگوں کے لئے بھی ان سے آگاہی کا امکان ہوتا تو انہیں پہلے ہی سے رمزی صورت میں نہ لایا جاتا۔البتہ عام انسانوں کے لئے ان حروف کے فوائد و برکات سے استفادہ کا امکان بہر حال پایا جاتا ہے جیسے علامہ طباطبائیؒ نے استفادہ فرمایا۔بہر کیف یہ حروف بھی قرآن کریم کا معجزہ ہیں ان میں خدائی اسرار و رموز پنہاں ہیں۔ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں علماء و اہل نظر حضرات ان کے فیوض و برکات سے مزید بہتر طور پر فائدہ اٹھائیں۔

سوالات

۱۔حروف مقطعات کیا ہیں؟ کیسے پڑھے جاتے ہیں؟اور کتنے سوروں کے آغاز میں آئے ہیں؟

۲۔مجموعی طور پر حروف مقطعات کے بارے میں کتنی طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں؟ وضاحت کیجئے۔

۳۔حروف مقطعات کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی روایت تحریر کیجئے۔

سولہواں سبق

قرآنی قصے

وعظ ونصیحت کی بات چاہے کتنی ہی نئی، انوکھی اور دلکش ہو خشک ہوتی ہے اور مخاطب کو بور کرنے والی ہوتی ہے۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے قصہ اور کہانی کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔ قصہ اور کہانی کے ذریعہ کلام میں تراوٹ و تازگی اور رونق و دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جو سننے والوں کو تر و تازہ رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا بیان اور یاد دہانی انسانی زندگی کو مرحلۂ کمال تک پہنچانے کا موجب ہوتی ہے۔ "فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ"

"آپ قصے بیان کیجئے شاید یہ تفکر کریں۔" (اعراف/۱۷۶)

قرآنی قصے کا مطلب ان سچے واقعات کو بیان کرنا ہے جن کے تلخ و شیریں تجربات سے انسانیت گذر چکی ہے۔ قرآن میں قصے اس وجہ سے بیان کئے گئے ہیں تاکہ اچھائیوں اور برائیوں کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے اور اچھائیاں ہمیشہ کے لئے نمونۂ عمل بن جائیں اور برائیوں کی پھر کبھی تکرار نہ ہو۔ قرآنی قصے جو عبرت و نصیحت کے لئے بیان کئے گئے فرضی اور ڈرامائی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ قصہ اسی وقت عبرت ناک ہوسکتا ہے جب حقیقت کا ترجمان ہو نہ کہ خیال و اوہام کا۔ کیونکہ یہ خیالات نہ تو اچھائیوں اور برائیوں کی حقیقت پیش کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کیلئے پکا ثبوت ہو سکتے ہیں۔

قرآنی قصوں کے امتیازات

(۱) صرف کارآمد پہلوؤں کا انتخاب

قرآن کوئی تاریخی اور قصہ کہانی کی کتاب نہیں ہے، صرف ہدایت کی کتاب ہے اور عبرت و نصیحت کے لئے انسانی تاریخ میں رونما ہونے والے اچھے اور برے واقعات بیان کردئے ہیں لہٰذا واقعات کے صرف انہیں پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے جن میں پیغام، سبق اور نتیجہ پایا جاتا ہے۔ کسی بھی واقعہ کو تمام و کمال بیان نہیں کیا ہے۔ ادبی کہانیوں کے برخلاف سارے عناصر کو حذف کر کے صرف کارآمد اور مقصد سے ہم آہنگ حصوں سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً بہت سے قصوں میں نام بجنام افراد اور شخصیات کے تذکرہ سے گریز کیا گیا ہے۔ جیسے اصحاب کہف، اصحاب فیل، زوجہ فرعون اور مادر موسیٰ وغیرہ کے نام۔

البتہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی، وہاں ناموں کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے مثلاً مریم، موسیٰ، عیسیٰ وغیرہ۔ لیکن جہاں مقصد تک پہنچنے میں نام کا کوئی دخل نہیں تھا، وہاں نام کے بجائے صفت کا تذکرہ کر دیا گیا ہے یا اس سے مطلقاً ہی گریز کر لیا گیا ہے اور ساری توجہ صرف مقصد اور ہدف پر صرف کر دی گئی۔ اس کی بہترین مثال سورۂ شمس میں بیان کی گئی قوم ثمود کی حکایت ہے:

"كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰيهَا اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا"

"قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر رسول کی تکذیب کی، جب ان کا بدبخت اٹھ کھڑا ہوا تو خدا کے رسول نے کہا کہ خدا کی اونٹنی اور اس کی سیرابی کا خیال رکھنا، تو ان لوگوں نے اس کی تکذیب کی اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالی تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کر دیا اور انہیں بالکل

برباد کردیا، اور اسے اس کے انجام کا کوئی خوف نہیں ہے۔ (سورۂ شمس ۱۱-۱۵)

اس حکایت کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ قوم ثمود نے اللہ کے رسول اور ان کے معجزہ کو کس طرح جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا۔ لہٰذا ان آیات میں ساری توجہ اس بات کی طرف دی گئی ہے اور حکایت کے سارے عناصر کو اسی غرض کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اس واقعہ میں قوم ثمود کا نام تو ہے، لیکن اس کی اصلی شخصیت یعنی حضرت صالحؑ اور ان کے ناقہ کو پے کرنے والے بدبخت کے نام لینے کے بجائے ایک کو "رسول اللہ" اور دوسرے کو "اشقٰھا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (مزید تفصیلات کے لئے پڑھئے علوم قرآنی از ص ۲۷۴/ تا ۲۷۵)

(۲) حق وصداقت

قرآنی قصے ادبی اعتبار سے واقعی اور حقیقی شمار کئے جائیں گے کیوں کی قرآن مجید کے سارے قصے برحق ہیں "نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ" (کہف/۱۳)

"ہم اصحاب کہف کے بارے میں آپ پر جو کچھ نازل کر رہے ہیں وہ عین حق ہے اور ہرگز خیالی پرواز نہیں ہے۔"

اس بناء پر قرآن کے غیر معمولی (خارق العادۃ) واقعات وحوادث بھی واقعی اور حقیقی ہیں، خواہ انہیں معجزہ کہا جائے جیسے عصائے موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی مسیحائی وغیرہ یا فقط ایک حیرت انگیز اور تعجب خیز واقعہ کہا جائے مثلاً حضرت موسیٰؑ کا دریائی سفر، حضرت عزیرؑ کی سو سالہ نیند اور اصحاب کہف کا تین سو سال تک سونا، پھر جاگنا اور پھر سو جانا۔

(۳) تعلیم وتربیت

اب تک بیان ہونے والی خصوصیات سے واضح ہو گیا کہ قرآن مجید نے فقط دلچسپی پیدا کرنے اور عربوں کو لبھانے کے لئے داستانیں بیان نہیں کی ہیں بلکہ ان قصوں کے پیچھے پاک و

پاکیزہ اغراض ومقاصد یعنی تعلیم وتربیت کا راز پوشیدہ ہے۔

قرآنی قصے کے ہدف اور مقاصد

سید قطب نے قرآنی قصوں کے کئی ہدف اور مقاصد بیان کئے ہیں جنہیں ہم بالترتیب درج کر رہے ہیں:

(۱) وحی الٰہی اور رسالت محمدی کا اثبات

پیغمبر اسلامؐ نے کسی درسگاہ سے تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ ہی کسی عالم کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے مگر پھر بھی بہت دقیق اور عالمانہ انداز میں حضرت ابراہیمؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، اور عیسیٰؑ جیسے نبیوں کے قصے بیان فرمائے۔ اتنی تفصیلی اور دقیق معلومات پیغمبر اسلامؐ جیسے شخص کے لئے بغیر وحی ناممکن تھی۔ اسی وجہ سے قرآن کے حیرت انگیز قصوں کو اس کتاب کے وحی الٰہی ہونے کی سب سے بڑی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں بھی اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے:

"اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ،نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ."

(یوسف/۲-۳)

"ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے کہ شاید تم لوگوں کو عقل آجائے، پیغمبر ہم آپ کے سامنے ایک بہترین قصہ بیان کر رہے ہیں جس کی وحی اس قرآن کے ذریعہ آپ کی طرف کی گئی ہے اگرچہ اس سے پہلے آپ اس کی طرف سے بے خبر لوگوں میں سے تھے۔

اس آیت میں تاکید کی گئی ہے کہ آپؐ ان واقعات اور قصوں سے مطلقاً مطلع نہ تھے، ہم نے یہ معلومات بذریعۂ وحی آپ کو عطا فرمائی اور یہ قران مجید کے وحی ہونے کا بالکل واضح ثبوت ہے۔

(۲) یہ بتانا کہ دین کی بنیاد وحی پر ہے

یعنی اس امر کی وضاحت کرنا کہ حضرت نوحؑ سے لیکر پیغمبر اسلامؐ تک کے سارے نبیوں کا لایا ہوا دین ایک تھا۔ شکلیں الگ الگ تھیں حالانکہ ان سب کی بنیاد ایک تھی اور وحی الٰہی تھی۔ ان سارے پیغمبروں کی امتوں کا خدا ایک رہا ہے اور وہ وہی خدائے واحد اور معبود حقیقی ہے۔

سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۴۸ تا ۹۲ کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اتنی تفصیل کے ساتھ گذشتہ انبیاء کے حالات اس لئے بیان کئے گئے ہیں تا کہ ایک نتیجہ تک پہنچا سکے اور وہ یہ ہے کہ سارے انبیاء کا راستہ ایک تھا سب کی باتیں ایک تھیں اور ساری امتوں کے صاحبان ایمان درحقیقت ایک ہی امت ہیں۔

(۳) مختلف زمانوں میں انبیاء کے انداز تبلیغ کی وضاحت

اگر چہ ان سب (انبیاء) کا راستہ ایک تھا اور سب ایک ہی منزل مقصود تک پہنچے مگر چونکہ ہر دور کے مخالفین حق اور منکرین نبوت نے ان کے مشن کو ناکام بنانے کے لئے الگ الگ حربے اختیار کئے (اگر چہ ان سب کا مقصد بھی ایک تھا باطل کی جیت اور حق کی نابودی) لہٰذا انبیاء نے بھی ہر زمانہ میں مختلف تدبیروں اور الگ الگ حکمت عملی سے ان کا مقابلہ کیا جن سے آگاہی دور حاضر کے مبلغین اسلام کے لئے بھی یقیناً کارآمد اور مفید ہوگی۔

(۴) ادیان ابراہیمی کے مشترکہ نکات کی توضیح

سبھی الٰہی شریعتوں خصوصاً شریعت اسلام کی بازگشت شریعت ابراہیمی تک ہوتی ہے یہودیت۔ عیسائیت۔ اسلام اور شریعت ابراہیمی میں جو باہمی ارتباط پایا جاتا ہے وہ دوسرے ادیان میں ہرگز نظر نہیں آتا۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے قصوں میں بار بار اس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

"اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی، صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ وَمُوْسٰی" (اعلیٰ/۱۹)

"یہ بات پہلے کے صحیفوں میں بھی موجود ہے، ابراہیمؑ کے صحیفوں میں بھی اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں بھی۔

"مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ هُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ" (حج/۷۸)

"یہی تمہارے بابا ابراہیمؑ کا دین ہے اس نے تمہارا نام پہلے بھی اور اس قرآن مین بھی مسلم رکھا ہے۔"

"وَقَفَّیْنَا عَلٰی آثَارِهِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ مُصَدِّقاً لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَیْنَاهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدیً وَنُوْرٌ وَمُصَدِّقاً لِّمَابَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدیً وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ" (مائدہ/۴۶)

"اور ہم نے انہیں انبیاء کے نقش قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو چلا دیا جو اپنے سامنے کی توریت کی تصدیق کرنے والے تھے اور ہم نے انہیں انجیل دیدی جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ اپنے سامنے کی توریت کی تصدیق کرنے والی اور ہدایت تھی اور صاحبان تقوی کے لئے سامان نصیحت تھی۔

(۵) اس امر کی وضاحت کہ بالآخر انبیاء ہی کامیاب ہوں گے اور ان کو جھٹلانے والے ہلاک ہوں گے

اس طرح کے قصوں کے ذریعہ پیغمبر کے دل کو تسکین اور ان کے پیروکاروں کو اطمینان اور حوصلہ ملتا تھا:

"وَکُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَکَ وَجَآئَکَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ"

"اور ہم قدیم رسولوں کے واقعات آپ سے بیان کر رہے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ آپ کے دل کو مضبوط رکھے اور ان واقعات میں حق، نصیحت اور صاحبان ایمان کے لئے سامان عبرت بھی ہے۔"
(ہود/۱۲۰)

(۶) تبشیر وانذار کا ثبوت

یعنی گذرے ہوئے لوگوں کی عاقبت اور انجام درحقیقت انبیاء کی بشارتوں اور عذاب الٰہی کے وعدوں کی تصدیق اور تائید ہے:

"نَبِّئْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ☆ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ"

"میرے بندوں کو خبر کر دو کہ میں بہت بخشنے والا اور مہربان ہوں، اور میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے۔"

(حجر/۵۰-۴۹)

(۷) اس بات کی وضاحت کے لئے کہ اللہ کے نیکی بندے، اولیاء کرام اور انبیاءؑ ہمیشہ اپنے رب کی خصوصی نعمت وعنایت سے سرفراز رہے ہیں

ان (انبیاء واولیاء) کے واقعات اور سوانح زندگی بیان کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اللہ کے نیک بندے ہمیشہ مطمئن اور بے خوف وہراس ہیں اور خود کو الطاف الٰہی کی پناہ میں سمجھیں۔

"اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّةِ آدَمَ وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّ مِنْ ذُرِّیَّةِ اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْرَائِیْلَ وَمِمَّنْ هَدَیْنَا وَاجْتَبَیْنَا" (مریم/۵۸)

"یہ سب وہ انبیاء ہیں جن پر اللہ نے نعمت نازل کی ہے، ذریت آدمؑ میں سے اور ان کی نسل میں سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں اٹھایا ہے اور ابراہیمؑ واسرائیل کی ذریت میں سے اور ان میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی اور انہیں منتخب بنایا ہے۔"

اور اسی وجہ سے ہمیشہ ان کے ساتھ رہنے کی تاکید کی گئی ہے تا کہ انہی کی طرح عنایت الٰہی ہمارے شامل حال بھی ہو جائے۔

"وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰئِکَ رَفِیْقًا ☆ ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَکَفٰی بِاللّٰهِ عَلِیْمًا"

"اور جو بھی اللہ ورسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن پر خدا نے نعمتیں نازل کیں۔ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اور یہی بہترین رفقاء ہیں، یہ اللہ کی طرف سے فضل وکرم ہے اور خدا ہر ایک کے حالات کے علم کے لئے کافی ہے۔" (نساء/۶۹-۷۰)

(۸) انسانوں کو آگاہ کرنا کہ دوبارہ شیطان کے جال میں گرفتار نہ ہوں

کیونکہ انسان اور شیطان کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نفرت وعداوت کی دیواریں کھڑی ہوگئی ہیں، قرآن حضرت آدمؑ کی روداد بار بار زیادہ تر اسی مقصد کے لئے یاد دلائی گئی ہے۔

مجموعی طور پر قرآنی آیتوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآنی قصوں کے اہداف کچھ اس طرح ہیں:

(الف) تعلیم وتربیت

(ب) عبرت وتفکر

(ج) خرافات مٹا کے حقائق کو بیان کرنا اور دین کے صحیح نظریات وافکار کو نئی زندگی بخشنا۔

(د) انبیاء کی حقانیت کا ثبوت فراہم کرنا اور ان کے پیغام کی نشر واشاعت۔

(ھ) فتح وکامیابی کی بشارت دے کر پیغمبر اور مومنین کے دلوں کو سکون واطمینان بخشنا۔

قصوں کے بار بار دہرانے کا راز

قرآن مجید میں بہت سے قصے اور باتیں معمولی اختلاف کے ساتھ بار بار دہرائی گئی ہیں۔اس بار بار کی تکرار اور ذرا ذرا سے اختلاف میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں مثلاً فقر وفاقہ اور تنگ دستی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کرنے سے قرآن میں دو مرتبہ روکا گیا ہے:

"وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ" (انعام/۱۵۱)

"فقر وفاقہ کے وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ہم تم کو بھی رزق دیں گے اور ان کو بھی۔"

"وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ" (اسراء/۳۱)

"فقر وفاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ہم ان کو رزق دیں گے اور تم کو بھی۔"

پہلی آیت میں فرزندوں کا تذکرہ بعد میں کیا گیا ہے جبکہ دوسری آیت میں اولاد کا تذکرہ مقدم ہے۔اس کا راز یہ ہے کہ پہلی آیت میں باپ کے موجودہ فقر وتنگدستی قتل اولاد کا سبب قرار پائی ہے۔لہٰذا اطمینان دلایا گیا کہ فی الحال تمہارے رزق اور مستقبل میں تمہاری اولاد کے رزق کا ذریعہ خدا ہی ہے۔اس بناء پر تم بھی اور تمہاری اولاد بھی اسی کی محتاج ہیں۔لیکن دوسری آیت میں لوگوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں اولاد کے اخراجات کے سبب آگے چل کر فقیر اور تنگدست نہ ہو جائیں لہٰذا یہ اطمینان دلایا گیا کہ تمہارے بچوں کا رزق دراصل تمہارے ذمہ نہیں ہے کہ تمہاری فقیری کا سبب بن سکے بلکہ تمہارے بچوں اور خود تمہاری روزی کا مالک اللہ ہے۔

(اسرار التکرار فی القرآن، ۷۵، نمبر ۱۱۵)

قرآن اور توریت وانجیل کے قصوں میں فرق

قرآن مجید کی طرح توریت وانجیل میں بھی قصے بیان کئے گئے ہیں مگر قرآنی قصوں سے ہرگز ان کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ:

۱۔موجودہ توریت وانجیل کے قصوں میں دوسری تاریخی کتابوں کی طرح صرف تاریخ نگاری کا پہلو پایا جاتا ہے اور حتی الامکان تاریخی واقعات مکمل طور سے ایک دوسرے سے متصل درست ونادرست کی پرواہ کئے بغیر نقل کر دئے گئے ہیں۔جب کہ قرآن میں تاریخ نگاری سے پرہیز کرتے ہوئے واقعات کا صرف وہی حصہ نقل کیا گیا ہے جو لوگوں کی ہدایت اور نصیحت میں موثر ہو اور اسی وجہ سے قرآنی قصے سلسلہ وار ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں۔

۲۔قرآنی قصوں میں اللہ کی عظمت وجلالت اور انبیاء کرام کے تقدس کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے، جب کہ توریت وانجیل خصوصاً توریت کے قصوں میں انبیاء تو انبیاء خدا کا وہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ عقل سر دھنتی رہ جائے۔مثال کے طور پر توریت میں خلقت انسان کا تذکرہ ذیل کی سطروں میں پیش کیا جارہا ہے:

"خدا نے آدمؑ سے کہا کہ درخت کا پھل کھاؤ مگر درخت علم ومعرفت کے قریب بھی نہ جانا، اس لئے کہ جس دن اس درخت کا پھل کھالوگے اسی دن مرجاؤ گے۔سانپ جو حیوانات میں سب سے ہوشیار تھا، عورت (حواؑ) کے پاس آیا اور بولا اس درخت کا پھل کھانے سے تم لوگوں کو موت نہیں آئے گی۔اللہ نے تو صرف اس لئے منع کیا ہے کہ اسے معلوم ہے کہ اس کا پھل کھانے کے بعد تم لوگ ہوشیار اور عقل مند ہو جاؤ گے اور اچھا برا سمجھنے لگو گے۔الغرض عورت (حواؑ) نے اس درخت کا پھل کھالیا اور اپنے شوہر کو بھی کھلا دیا۔پھر دونوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا اور خود کو ننگا دیکھا، تو انجیر کے پتوں کو توڑ کر اپنی شرمگاہیں چھپالیں، اسی اثناء میں باغ کی سیر کرتے ہوئے خدا کے پیروں کی چاپ سنائی دی، حضرت آدمؑ اور حواؑ نے اپنے آپ کو خدا سے چھپالیا۔خدا نے آواز دی آدمؑ! تم کہاں ہو؟ آدمؑ نے کہا: تیری آواز سن کے میں ڈر گیا اور چونکہ برہنہ ہوں لہٰذا خود کو چھپالیا۔خدا نے پوچھا تمہیں کس نے بتایا کہ تم برہنہ ہو؟ کیا اس درخت ممنوعہ کا پھل کھالیا؟ کہا: اے خدا! تو نے جس عورت کو میرا ہم نشین بنایا تھا، اس نے مجھے کھلا دیا۔اللہ نے عورت کو ڈانٹا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟

عورت نے کہا: شیطان نے ہمیں بہکا دیا۔ خدا نے کہا: اب تو انسان ہم لوگوں کی طرح ہو گیا، صاحب عقل وشعور اور نیک وبد کی تمیز رکھنے والا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ درخت زندگی کا پھل کھا کر زندۂ جاوید اور اَمر ہو جائے لہٰذا خدا نے اسے باغ سے باہر نکال دیا اور ننگی تلوار لئے ہوئے پہرے داروں کو باغ کے چاروں طرف بٹھا دیا تا کہ درختِ زندگی کی حفاظت اور نگرانی کریں۔ (تورات سفر پیدائش باب اول تا سوم)

خدا آدمؑ کے ہوشیار ہونے سے خوف زدہ تھا اور اسے یہ خدشہ تھا کہ کہیں آدمؑ "درخت زندگی" کا پھل کھا کے ملکوتیوں کی طرح اَمر نہ ہو جائے لہٰذا اس مسئلہ میں خدا آدمؑ سے جھوٹ بولا۔ اس کے علاوہ چہل قدمی کے وقت خدا آدمؑ کے چھپنے کی جگہ سے بے خبر تھا۔"

توریت کے ان جملوں میں خداوند عالم کو حاسد، جھوٹا، نادان اور بزدل بتایا گیا ہے، جب کہ قرآن مجید کی روشنی میں خداوند کریم انسانوں پر بے حد مہربان اسے اپنی امانت، خلافت اور علم و حکمت عطا کرنے والا بلکہ ملائکہ کے لئے بھی قابل تعظیم اور لائق سجدہ بنانے والا بتایا گیا ہے۔ اور اسی لئے خلقت انسان کے بعد خدا نے خود اپنا قصیدہ پڑھا "فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ" (مومنون ۱۴)

قرآن مجید میں تقدس پروردگار کے ساتھ ساتھ انسان کی عظمت ومنزلت کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے، جب کہ توریت میں انسان کو مردود بارگاہ الٰہی اور نہایت مذموم بتایا گیا ہے۔

موجودہ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا ماجرا اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ منصب نبوت کا تقدس جاتا رہا جب کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی مادر گرامی حضرت مریمؑ کی جلالت وعظمت بے مثال انداز میں بیان کی گئی ہے۔

انجیل متی اور لوقا میں ہے کہ حضرت مریمؑ یوسف نجار سے منسوب تھیں مگر شوہر کے گھر جانے سے پہلے ہی آپ کو حضرت عیسیٰؑ کا حمل ہو گیا۔ پھر یوسف نجار کو بھی خواب میں اس کی اطلاع ملی اور یہ حکم دیا گیا کہ وہ حضرت مریمؑ کو اپنے گھر لے آئیں مگر حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے پہلے آپ سے ہمبستری نہ کریں۔

ایک سوال

قرآن کے قصوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ سوال ذہنوں میں ابھر سکتا ہے کہ قرآن میں صرف مشرق وسطیٰ کے معروف نبیوں کا ہی تذکرہ کیوں کیا گیا ہے؟ دوسرے انبیاء اور شخصیات کا تذکرہ کیوں نہیں ہوا؟ کچھ اہل علم حضرات نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ دراصل انبیاء یہیں سے مبعوث ہوئے ہیں اور یہیں سے بشریت کی نشوونما ہوئی ہے۔

لیکن مناسب ہے کہ اس سوال کا جواب یوں دیا جائے کہ قصے کا مقصد سامعین کے لئے عبرت ونصیحت کا انتظام کرنا ہے لہٰذا ضروری ہوتا ہے کہ انہی مقدمات کا سہارا لیا جائے جو سامعین کے لئے واضح اور قابل قبول ہو اور چونکہ قرآن میں زیادہ تر عربوں سے خطاب ہوا ہے لہٰذا عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ جن انبیاء کرام اور شخصیات سے واقف تھے عام طور سے انہیں کا تذکرہ کیا گیا ہے ورنہ کسی مجمع میں ان ہستیوں کا تذکرہ کرنا جنہیں کوئی جانتا پہچانتا نہ ہو بے فائدہ اور غیر منطقی ہے۔ خصوصاً ایسے نبیوں اور افراد کا تذکرہ تو اور بھی زیادہ مضحکہ خیز ہوگا جو غیر تو غیر خود اپنی امتوں میں بھی انجان ہوں۔ مثلاً زرتشت یعنی مجوسیوں کے نبی جن سے واقفیت آج تک ان کے عقیدتمندوں کو بھی نہ ہو سکی اور انہیں ماقبل تاریخ کا نبی سمجھا جاتا ہے۔

سوالات

۱۔ کیا قرآن میں خیالی حکایتیں بیان ہوئی ہیں؟ وجہ بھی بتایئے۔

۲۔ قرآنی قصوں کے امتیازات گنایئے۔

۳۔ قرآنی قصوں کے کوئی چار اہداف بیان کیجئے۔

۴۔ ''ادیان ابراہیمی کے مشترکہ خصوصیات کو بیان کرنا قرآنی قصوں کا ہدف ہے'' ایک آیت کے ذریعہ اس جملہ کی وضاحت کیجئے۔

۵۔ قتل اولاد سے متعلق مکرر آیات میں کون سی حکمت پوشیدہ ہے؟ دونوں آیتیں لکھ کر کامل وضاحت کیجئے۔

۶۔ توریت وانجیل کے برخلاف قرآن کریم میں تاریخی واقعات تفصیل کے ساتھ کیوں نہیں بیان کئے گئے؟

۷۔ قرآن میں صرف مشہور ومعروف انبیاء کا تذکرہ ہی کیوں کیا گیا ہے؟

سترہواں سبق

قرآنی قسمیں

قسم وہ تاکید ہے جو کسی کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے لائی جاتی ہے۔ البتہ قسم انہی جگہوں پر کھائی جاتی ہے جہاں کوئی بہت ہی اہم مسئلہ درپیش ہو اور اتنی شدید تاکید کی ضرورت ہو کہ تاکید کے دوسرے وسائل کارآمد نہ ہو رہے ہوں، قرآن میں بھی عربی زبان کے طور طریقے کے مطابق یہ روش بروئے کار لائی گئی ہے۔

قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جو خود بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہو تاکہ سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ چونکہ قسم درحقیقت ایک طرح کی تشبیہ ہے جس کے ذریعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس طرح مُقْسَم بہ یعنی جس کی قسم کھائی جارہی ہے وہ بزرگی واہمیت کی حامل اور مسلم ہے، اسی طرح مُقْسَم علیہ یعنی جس چیز کے لئے قسم کھائی جارہی ہے وہ بھی اہم بزرگ اور قابل قبول ہے۔

اس بناء پر قسم دراصل تشبیہ اور تاکید کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ مقسم بہ اور مقسم علیہ دونوں کی اہمیت اجاگر کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔

قسم کے اجزاء اور عناصر

قسم (والے جملہ کو) تشکیل دینے والے عناصر کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ مقسم بہ یعنی جس چیز کے ذریعہ قسم کھائی جائے: انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں کبھی تو اللہ کی ذات وصفات کو قسم کا ذریعہ بناتا ہے اور کبھی ایک دوسرے کی جان کے ذریعہ قسم کھاتا ہے مثلاً ''میری جان کی قسم''، ''قسم تمہاری جان کی'' وغیرہ۔

لیکن شرعی قوانین صرف اسی قسم پر نافذ ہوتے ہیں جو اللہ کی ذات وصفات کے ذریعہ کھائی جائے۔

۲۔ مقسم علیہ یعنی وہ اہم بات جس کے لئے قسم کھائی جائے۔

۳۔ حرف قسم یعنی وہ حروف وکلمات جن کے ذریعہ قسم کھائی جائے۔

عربی زبان کے حروف قسم مندرجہ ذیل ہیں:

با، تا، واو اور لام: آخر کے تین حروف یعنی واو، تا اور لام قرآن مجید میں بھی استعمال ہوئے ہیں لیکن حرف باء اہم ترین حرف قسم ہونے کے باوجود بھی قرآن مجید میں قسم کے عنوان سے استعمال نہیں ہوا۔

۴۔ حرف جواب قسم یعنی وہ حروف جو جواب قسم کے اوپر آتے ہیں اور مقسم علیہ کا پتہ بتاتے ہیں کچھ اس طرح ہیں:

لام مفتوحة (لَ)، ان بشرطیکہ مکسور اور مشدد ہو (إنَّ)، لاء نافیہ، ماء نافیہ اور ''ان'' جب مخففہ اور نافیہ ہو۔

قرآنی قسم کی قسمیں

قرآنی قسموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ صریح قسمیں: صریح قسم اس قسم کو کہا جاتا ہے جس کے سارے عناصر ترتیب کے ساتھ کلام میں مذکور ہوں یعنی پہلے حرف قسم پھر مقسم بہ پھر جواب قسم اور آخر میں مقسم علیہ مذکور ہو۔

واضح رہے کہ قرآن میں اکثر وبیشتر قسمیں صریح ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ۲۹ سوروں میں ۸۱ مقامات پر صریح قسمیں کھائی ہیں۔

سوروں کی ترتیب کے اعتبار سے صریح قسمیں مندرجہ ذیل ہیں:

(نساء/۶۵، انعام/۲۳و۳۰، یونس/۵۳، یوسف/۷۳و۸۵، ۹۱، ۹۵، حجر/۷۲و۹۲، نحل/۵۶و۶۳، انبیاء/۵۷، شعراء/۹۷، یٰس/۱و۳، صافات/۱و۴، ص/۱۰، دخان/۱و۳، ق/۱، ذاریات/۱، ۸و۲۳، طور/۱و۷، نجم/۱و۲، قلم/۱و۲، مدثر/۳۲و۳۵، مرسلات/۱و۷، نازعات/۱و۶، بروج/۱و۴، طارق/۱و۴، فجر/۱و۵، شمس/۱و۹، لیل/۱۔۴، ضحیٰ/۱و۳، تین/۱و۵، عادیات/۱و۶، عصر/۱و۲، علوم قرآنی (انتشارات التمہید وسمت) ص ۲۹۷و۲۹۸)

مثال میں صرف تین مقامات کے تذکرے پر اکتفا کررہے ہیں:

" نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ، مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ" (قلم/۱۔۲)

" قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ....." (اگر جواب قسم کا لام فعل ماضی پر آئے تو فعل ماضی سے پہلے قد کا لانا ضروری ہے) "مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ" (یوسف/۷۳)

" لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ" (حجر/۷۲)

پہلی آیت میں واو کے ذریعہ قلم کی، دوسری آیت میں تا کے ذریعہ اللہ کی اور تیسری آیت میں لام کے ذریعہ ایک نبی خدا کی جان کی قسم کھائی گئی ہے۔

۲۔ منفی قسمیں منفی قسم اس قسم کو کہا جاتا ہے جس میں حرف نفی بھی قسم کے ساتھ ہو جیسے " لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ" (قیامت/۱)۔ اکثر مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس طرح کی قسموں میں حرف نفی 'لاء' زائدہ ہے اور آیت کا ترجمہ لاء کو حذف کرکے کیا جائے گا مثلاً فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ (واقعہ/۷۵) کا ترجمہ وہی ہوگا جو فَاُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ کا ترجمہ ہوگا کیونکہ 'لاء' زائد ہے اور اس کا فائدہ تاکید ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ لام اس طرح کی قسموں میں زائد نہیں ہے بلکہ اپنی اصلی حالت میں منفی ہونے پر باقی ہے اور اس طرح کی قسموں میں منفی ہونے پر باقی ہے اور اس طرح کی قسموں میں "مقسم بہ" کی اہمیت کے پیش نظر خدا کی قسم کھانے سے گریز کر رہا ہے۔ جیسے " فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ" (واقعہ/۷۶۔۷۵) میں خدا فرماتا ہے کہ میں تاروں کے منازل کی قسم نہیں کھاتا ہوں اس لئے کہ اگر تم درک کرلو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔

"لا" کا استعمال درحقیقت "مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ" کی قسم کھانے سے انکار پر دلالت کرتا ہے اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ ستاروں کے منازل اس سے کہیں برتر ہیں کہ ان کی قسم کھائی جائے، لہٰذا "لا" کے ذریعہ اس کی نفی کردی گئی ہے تاکہ "مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ" کی عظمت و برتری کا بخوبی اندازہ ہوجائے۔

(تفسیر کشاف ج۴، ص۶۵۷ تا ۶۵۹)

قرآن مجید کے ۶ سوروں میں ۱۵ مقامات پر اللہ نے منفی قسم کھائی ہے۔ ہم نے ان سب کو اپنی کتاب "علوم قرآنی" میں بیان کردئے ہیں۔

۳۔ تقدیری قسمیں

بحث کا آغاز کرنے سے پہلے "لام موطئہ" سے واقفیت ضروری ہے۔ ابن ہشام کے بقول کبھی کبھی حرف شرط کے اوپر ایک لام آتا ہے جو دلالت کرتا ہے کہ اس کے بعد والا جملہ جواب قسم ہے نہ کہ جواب شرط جیسے "وَاللّٰهِ لَئِنْ اَتَيْتَنِيْ لَآتِيَنَّكَ" اس مثال میں "ان" شرطیہ کے اوپر جو "لام" آیا اسی کو لام موطئہ کہا جاتا ہے اور اس کو "موطئہ" یا "موذنہ" اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ جواب کو قسم کے لئے آمادہ کرتا ہے اور جواب شرط سے مشتبہ نہیں ہونے دیتا۔ اس طرح کی قسم کبھی کبھی پوشیدہ ہوتی ہے جس کے نمونے قرآن مجید میں بے شمار ہیں

جیسے " لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ" (حشر/۱۲)

"وہ اگر نکال بھی دئے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہ نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ہرگز ان کی مدد نہ کریں گے اور اگر مدد بھی کریں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے اور پھر ان کی کوئی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔"

ان تینوں جملوں میں جو "لئن" کے ذریعہ شروع ہوئے ہیں "لئن" سے پہلے "اللہ" یعنی مقسم بہ پوشیدہ ہے۔ اس طرح کی قسموں کو تقدیری قسم کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی قسم قرآن مجید میں ۶۱ مقامات پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

" وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ" (توبہ/۷۵)

"ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ اگر وہ اپنے فضل و کرم سے عطا کردے گا تو اس کی راہ میں صدقہ دیں گے۔"

قرآن میں تقدیری قسم کبھی کبھی "لام موطئہ" کے بغیر بھی نظر آتی ہے۔ جیسے: " وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ" (انعام/۱۲۱)

اگر تم لوگوں نے ان کی اطاعت کرلی تو تمہارا شمار مشرکین میں ہوجائے گا۔

یہ جملہ دراصل اس طرح ہے "وَاللّٰهِ لَئِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ" اور " اِنَّكُمْ مُشْرِكُوْنَ" قسم یعنی واللہ کا جواب ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں کہ جس چیز کے ذریعہ قسم کھائی جاتی ہے اسے بزرگی اہمیت والی ہونا چاہیئے تاکہ جس چیز کے لئے قسم کھائی جارہی ہے اس کی اہمیت اور عظمت کما حقہ آشکار کرسکے۔ انسان اپنی گفتگو میں عموماً ذات و صفات الٰہی، اپنے دین، آئین کے مقدسات اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی جان کی قسمیں کھاتا ہے جب کہ قرآن مجید میں بہت سی

چیزوں کو ذریعہ قسم قرار دیا گیا ہے جنہیں ہم مختصر طور پر بیان کر رہے ہیں:

ذاتِ کردگار

قرآن مجید میں دو الفاظ کے سہارے ذات پروردگار کی قسم کھائی گئی ہے:

(۱) اللہ (۲) رب

"وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ" (انعام/۲۳)

خدا کی قسم ہم مشرکین نہیں تھے۔

"وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ" (یونس/۵۳)

میرے رب کی قسم یہ (عذاب) حق ہے۔

قرآن کریم، شریعت اسلام اور اس کے پیغمبر

"وَالْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ" (یٰس/۲)

قرآن حکیم کی قسم

"وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ" (دخان/۲)

کتاب مبین کی قسم

کتاب سے مراد شریعت اور قوانین اسلام ہیں۔

"لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ" (حجر/۷۲)

آپ کی جان کی قسم یہ لوگ گمراہی کے نشے میں اندھے ہو رہے ہیں۔

ابن عباس کے بقول خدا نے پیغمبر اسلامؐ سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہیں کی۔ اسی وجہ سے آپ کی جان کے علاوہ کسی اور کی جان کے ذریعہ قسم نہیں کھائی (مجمع البیان ج ۶/، ص ۳۴۲/)

لیکن صاحب کشاف زمخشری نے اسے فرشتوں کا کلام قرار دیا ہے جس کے مخاطب حضرت لوطؑ ہیں۔

فرشتے

"وَالصَّافَّاتِ صَفًّا، فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا" (صافات/۱۔۳)

باقاعدہ طور پر صفیں باندھنے والوں کی قسم، پھر مکمل طریقہ سے تنبیہ کرنے والوں کی قسم۔

"فَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْرًا" (ذاریات/۴)

پھر ایک امر کی تقسیم کرنے والی ہیں۔

انسان اور اس کی باطنی خصلتیں

"وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا" (شمس/۷،۸)

اور نفس کی قسم اور جس نے اسے درست کیا، پھر بدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے۔

قیامت

اس قیامت کی قسم جو مادی زندگی کا خاتمہ اور حقیقی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔

"وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ" (بروج/۲)

اور اس دن کی قسم جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

عالم ہستی کے مخلوقات

جیسے آسمان، زمین، ستارے، روز و شب۔ چاند، سورج، بادل، ہوا، دریا اور وہ تمام چیزیں جو ظاہر یا پوشیدہ ہیں:

"وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ" (طارق/۱)

آسمان اور رات کو آنے والے کی قسم۔

"وَالْاَرْضِ وَمَاطَحَاهَا" (شمس/۶)

زمین کی قسم اور جس نے اسے بچھایا ہے۔

"وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ، وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ، وَاللَّيْلِ اِذَا يَسْرِ" (فجر/۱تا۴)

قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت وطاق کی اور رات کی جب وہ جانے لگے

"وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفاً، فَالْعَاصِفَاتِ عَصْفاً، وَالنَّاشِرَاتِ نَشْراً"

(مرسلات/۱تا۳)

ان کی قسم جنہیں تسلسل کے ساتھ بھیجا گیا پھر تیز رفتاری سے چلنے والی ہیں اور قسم ہے ان کی جو اشیاء کو منتشر کرنے والی ہیں۔

"وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ" (طور/۶)

اور بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم۔

مقدس مقامات

جیسے کوہ طور، بیت معمور، قدس اور شہر امین وغیرہ۔

"وَالطُّوْرِ" (طور۱) "وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ" (طور/۴)

"وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ، وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ، وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ" (تین/۱تا۳)

سوالات

۱۔ قسم اور تاکید میں کیا فرق ہے؟

۲۔ قسم کے عناصر بیان کیجئے؟

۳۔ قرآنی قسمیں کتنی طرح کی ہیں سب کا نام بتایئے؟

۴۔ صریح قسم کی مع مثال وضاحت کیجئے؟

۵۔ "فَلَا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ" میں کون سی قسم پائی جاتی ہے اور اس میں "لا" کے سلسلہ میں مصنف کا کیا نظریہ ہے؟

۶۔ "وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ" اس آیت میں قسم کی نوعیت، مقسم بہ اور جواب قسم کی وضاحت کیجئے؟

۷۔ قرآنی قسم کی چار مثالیں بیان کیجئے؟

اٹھارہواں سبق

قرآنی تمثیلات (قرانی مثالیں)

تمثیل یا ضرب الامثال کا مطلب ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن میں ایسی خیالی منظر کشی کی جائے کہ سننے والا یا دیکھنے والا اس قدر متاثر ہو جائے کہ اس کے ذہن میں خیال پیدا ہو جائے کہ جیسے بنفس نفیس موقع پر موجود ہو اور بہت نزدیک سے حادثات کا مشاہدہ کر رہا ہو۔ کبھی کبھی تصویر کشی اتنی معیاری ہوتی ہے کہ سننے یا دیکھنے والا خود اپنے آپ کو اس معرکہ کا فاتح یا اس کارنمایاں کا ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔

قرآن مجید نے بھی بلند و بالا مطالب کو تمثیل، تشبیہ اور استعارہ کے پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ تمثیل یا ضرب المثل قرآن مجید کا وہ اسلوب بیان ہے جس نے سامعین پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ اسے تبلیغ کو با اثر بنانے کے ممکنہ وسائل میں سے ایک بہترین وسیلہ شمار کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی ہر مثل نے ماہرانہ فوٹو گرافی کی طرح پیش نظر حالات و کوائف کی منظر کشی کی ہے جس میں انسانی زندگی کے بدنما اور خوشنما مناظر کو دیکھ کر انسان حق و باطل کا فیصلہ خود بخود کر سکتا ہے۔ تمثیل در حقیقت ایک فرضی تصویر ہوتی ہے جو انسانوں کے باطنی حقائق کو پیش کرتی ہے اور انسان کی تخیل اسے ایک محسوس حقیقت سمجھتی ہے۔ ماہرین فن کے بقول مثل کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی غیر محسوس چیز کو محسوس شے سے تشبیہ دینا تا کہ مخاطب کو یہ گمان نہ ہو کہ متکلم جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہے، اسے ظاہری حواس کے ذریعہ درک کیا جا سکتا ہے۔

"وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ" (حشر/٢١)

اور ہم ان مثالوں کو انسانوں کے لئے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ شاید وہ کچھ غور و فکر کر سکے۔

حق مثلہا راز ند ہر جا بہ جاش	می کند معقول را محسوس وفاش
تا کہ دریا بند مردم از مثل	آنچہ مقصود است بے نقص وخلل

خداوند متعال با موقع اور برمحل مثل بیان کر کے ایک عقلی مسئلہ کو بالکل واضح اور قابل حساس بنا دیتا ہے تا کہ قرآنی مثل کے ذریعہ لوگ مقصود پروردگار کو بغیر کمی اور زیادتی کے من وعن، بالکل صحیح صحیح سمجھ سکیں۔

تمثیل کی خوبیاں (خصوصیتیں)

ابن اثیر (متوفی ٦٣٧ھ) کے بقول تمثیل میں تین خصوصیتیں پائی جاتی ہیں:

١۔ مبالغہ ٢۔ بیان ٣۔ ایجاز

(المثل السائر ج٢/، ص/١٢٣)

مبالغہ یعنی مخاطب کو سمجھانے کے لئے تاکید سے کام لینا اور مقصود کلام کو پورے طور پر اس کے ذہن تک پہنچانا، عین ممکن ہے کہ مثل سے خالی اور عام گفتگو مقصود کلام کی وضاحت اور پورے طور پر اسے مخاطب کے ذہن تک پہنچانے سے قاصر ہو لیکن تشبیہ وتمثیل سے آراستہ کلام مقصود متکلم کو کامل طور سے بیان کرتا ہے مثلاً قرآن مجید نے کافروں کے بے ہدف اعمال کو تمثیلی انداز سے یوں بیان فرمایا ہے:

"مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ" (ابراہیم/١٨)

"جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے آندھی کے دن تند ہوا اڑا لے جائے کہ اپنے حاصل کیے ہوئے پر بھی کوئی اختیار نہ رکھیں گے اور یہی بہت دور تک پھیلی ہوئی گمراہی ہے۔"

اس آیت میں اللہ نے کافروں کے اعمال کو راکھ سے تشبیہ دی ہے جو ہوا کے معمولی جھونکوں سے بھی فضا میں منتشر ہو جائے۔ اس تشبیہ اور توصیف کی مدد سے کفار کے اعمال کا بے بنیاد اور ناپائدار ہونا بخوبی آشکار ہوتا ہے جب کہ مثل سے خالی اور سادہ کلام اس مفہوم کی وضاحت نہیں کر سکتا اگر کلام میں مذکور مثل بیان نہ ہوتی تو بات بطور کامل واضح نہ ہو پاتی، مثلاً اگر اللہ صرف یہ کہتا کہ کافروں اور ریاکاروں کے اعمال برباد اور ناپائدار ہیں تو اس بربادی اور ناپائداری کے احساس اور مشاہدہ سے ہم عاجز رہ جاتے۔ درحقیقت یہیں سے تمثیل کی دوسری خصوصیت یعنی "بیان" کی اہمیت بھی آشکار ہو جاتی ہے۔

بیان یعنی کلام کی مکمل وضاحت کے لئے تمثیلی کلام اور سادہ اور مثل سے خالی کلام سے کہیں زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔

ایجاز یعنی کلام مختصر ہو مگر مفہوم وسیع اور بلند ہو۔ ایجاز بھی تمثیلی کلام میں زیادہ بہتر طور پر دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ تمثیل کی وجہ سے بہت وسیع اور بلند و بالا مفاہیم بھی نہایت مختصر اور کم سے کم الفاظ میں بیان کر دئے جاتے ہیں۔

قرآن میں تمثیل کی صورتیں

اللہ نے قرآن مجید میں بار بار ضرب المثل (قرآن میں ضرب المثل کے دوسرے معانی بھی ہیں جو اسی سبق کے آخر میں بیان ہوں گے) یعنی مثل بیان کر کے اچھے اور برے افراد صالح اور شر پسند گروہوں کے حالات اور چھپی ہوئی خصلتیں ابھار کر پیش کر دی گئی ہیں اور

پھر تخیل کا سہارا لے کر معقول کو محسوس میں تبدیل کر دیا ہے البتہ یہ تمثیلیں ان حقائق کی ترجمانی بھی کرتی ہیں جن پر انسانی روش و کردار کا دارومدار ہے اور اس طرح مثبت و منفی، تعمیری و تخریبی افکار و نظریات ہمارے سامنے آجاتے ہیں اس مرحلے میں بھی قرآن منزل اعجاز پر فائز ہے۔

قرآن کریم میں بیان کی گئی تمثیل کی مختلف صورتیں ہیں۔ ہر صورت کی ایک ایک مثال ملاحظہ ہو:

(الف) ذہنی مفاہیم کو محسوسات کے دائرہ میں لانا

قرآن کریم نے نگاہ قدرت میں مردود اور سعادت اخروی سے محروم کفار کی تصویر دو طرح سے پیش کی ہے:۔

۱۔ ان لوگوں کے مانند جو آسمانوں کے دروازے کے پیچھے غمزدہ حالت میں کھڑے ہوں اور ان کے لئے دروازہ بند ہو۔

۲۔ محال کام کرنے کی کوشش مثلاً کسی موٹی رسی کو سوئی میں ڈالنا:۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ" (اعراف/۴۰)

بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور غرور سے کام لیا ان کے لئے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکہ کے اندر نہ داخل ہو جائے۔

(ب) روحانی اور معنوی کیفیات کی پیکر تراشی (مجسم کرنا)

جن لوگوں کے لئے تمیز اور معرفت کے سارے اسباب فراہم ہوں مگر پھر بھی وہ

سیدھے راستے سے منحرف ہوں، قرآن کریم نے ان کی تشبیہ ان لوگوں سے دی ہے جن کے لئے ہدایت کے سارے راستے بالکل بند ہوں جس کی وجہ سے ان کی زندگی سخت اضطراب اور بے چینی کے عالم میں بسر ہو رہی ہو: "وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيْنَ آتَيْنَاهُ..... يَلْهَثْ"

"اور انہیں اس شخص کی خبر سنایئے جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں پھر وہ ان سے بالکل الگ ہو گیا اور شیطان نے اس کا پیچھا پکڑ لیا تو وہ گمراہوں میں ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو اسے انہیں آیتوں کے سبب بلند کر دیتے لیکن وہ خود زمین کی طرف جھک گیا اور اس نے خواہشات کی پیروی اختیار کر لی تو اب اس کی مثال کتے جیسی ہے کہ اس پر حملہ کرو تو بھی زبان نکالے رہے اور چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔" (اعراف/۱۷۵۔۱۷۶)

(ج) انسانی کرداروں کی تصویر کشی

قرآن مجید میں جا بجا انسانی حالات و کردار کے نمونے پیش کئے گئے ہیں ان میں باطل پرست، سرکش لوگ جو مختلف حیلوں اور بے سر و پیر کی باتوں کو لے کر بغیر سوچے سمجھے حق سے ٹکراتے ہیں ان کی کچھ اس طرح سے منظر کشی کی گئی ہے:

"وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ،لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ" (حجر/۱۴و۱۵)

"ہم اگر آسمان میں ان کے لئے کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ لوگ دن دہاڑے اسی دروازہ سے چڑھ جائیں تو بھی کہیں گے کہ ہماری آنکھوں کو مدہوش کر دیا گیا ہے اور ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

(د) واقعات کی منظر کشی

قرآن مجید میں مفاہیم، حالات اور شخصیتوں کی تصویر کشی کے علاوہ بہت سے واقعات اور جنگوں کی منظر کشی بھی اس انداز سے کی گئی ہے کہ سارے حرکات و سکنات نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان میں جنگ خندق کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی نمایاں کامیابی اور مشرکین کی شکست سے فاش، میدان جنگ کی نقل و حرکات اور دونوں گروہوں کی قلبی کیفیات اور افکار و نظریات کو اس طرح آشکار کر دیا گیا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود میدان جنگ میں موجود ہو اور سارے حالات کا نزدیک سے مشاہدہ کر رہا ہو۔

"ایمان والو! اس وقت اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب کفار تمہارے اوپر کی طرف سے اور نیچے کی سمت سے آ گئے اور دہشت سے نگاہیں خیرہ کرنے لگیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کے خیالات میں مبتلا ہو گئے، اس وقت مومنین کا باقاعدہ امتحان لیا گیا اور انھیں شدید قسم کے جھٹکے دیئے گئے، اور جب منافقین اور جن کے دلوں میں مرض تھا یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور رسول نے ہم سے صرف دھوکہ دینے والا وعدہ کیا ہے، اور جب ان کے ایک گروہ نے کہہ دیا کہ مدینہ والو! اب یہاں ٹھکانہ نہیں ہے لہٰذا واپس بھاگ چلو اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت مانگ رہا تھا کہ ہمارے گھر خالی پڑے ہوئے ہیں حالانکہ وہ گھر خالی نہیں تھے بلکہ یہ صرف بھاگنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ (احزاب/۹ تا ۱۳)

(ھ) عینی اور خارجی اوصاف کی تصویر کشی

قرآن مجید میں بیان کی گئی مثالوں کی قسموں میں سے ایک قسم خارجی وجود رکھنے والی

اشیاء کے اوصاف کی منظر کشی پر مشتمل ہے۔ قرآنی تصویر کشی میں ان چیزوں کے اچھے برے اور مثبت و منفی اثرات بخوبی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ منجملہ دنیاوی زندگی اور اس کی ناپائداری کے بارے میں ارشاد ہوا:۔ ''وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيَاحُ''

(کہف/۴۵)

اور انھیں زندگانیٔ دنیا کی مثال اسی پانی کی بتایئے جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا تو زمین کی روئیدگی اسی سے مل جل گئی پھر آخر میں وہ ریزہ ریزہ ہو گئی جسے ہوائیں اڑا دیتی ہیں۔

اللہ نے دنیاوی زندگی کو روح پرور بارش سے تشبیہ دی ہے۔ زمین کی شادابی رنگ برنگے پودوں کی لہلہاہٹ اور پورے عالم وجود کی تازگی کا سبب ہوتی ہے لیکن زمین کی شادابی اور تازگی ہمیشہ باقی نہیں رہتی بہت جلد ہی بادِ خزاں کی نذر ہو جاتی ہے۔

آپ برسات کے دلکش منظر کا تصور کیجئے۔ وہ کتنا پر کیف اور لذت بخش ہوتا ہے۔ بارش کے ساتھ ساتھ پودوں کی نشو ونما اور زمین کی ہریالی دل کو بھاتی ہے لیکن گھاس، پھول اور سبزے دیکھتے ہی دیکھتے خشک ہو کر بادِ خزاں کے جھونکوں سے فضا میں بکھر جاتے ہیں (دنیاوی زندگی بھی بالکل اسی طرح ہے۔ اے کاش! لذات دنیا کے اسیر اور حرص و ہوس میں گرفتار افراد عبرت حاصل کر لیتے:۔)

(و) ضرب المثل کے طور پر بیان ہوئے قصوں کی منظر کشی

قرآن مجید میں جن چیزوں کی منظر کشی کی گئی ہے ان میں وہ قصے بھی شامل ہیں جنھیں ضرب المثل کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل قصہ ملاحظہ کیجئے:

ہم نے ان کو اسی طرح آزمایا ہے جس طرح باغ والوں کو آزمایا تھا۔ جب انھوں نے قسم کھائی تھی کہ صبح کو پھل توڑ لیں گے، اور انشاء اللہ نہیں کہیں گے، تو خدا کی طرف سے راتوں رات ایک بلا نے چکر لگایا، جب یہ سب سو رہے تھے، اور سارا باغ جل کر کالی رات جیسا ہو گیا۔ پھر صبح کو ایک نے دوسرے کو آواز دی کہ پھل توڑنا ہے تو اپنے اپنے کھیت کی طرف چلو۔ پھر سب گئے اس عالم میں کہ آپس میں رازدارانہ باتیں کر رہے تھے کہ خبردار! آج باغ میں کوئی مسکین داخل نہ ہونے پائے اور روک تھام کا بندوبست کر کے صبح سویرے پہنچ گئے۔ اب جو باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو بہک گئے بلکہ بالکل سے محروم ہو گئے۔ تو ان کے منصف مزاج نے کہا کہ میں نے نہ کہا تھا کہ تم لوگ تسبیح پروردگار کیوں نہیں کرتے۔ کہنے لگے کہ ہمارا رب پاک و بے نیاز ہے اور ہم واقعاً ظالم تھے۔ پھر ایک نے دوسرے کو ملامت کرنا شروع کر دی۔ کہنے لگے کہ افسوس ہم بالکل سرکش تھے، شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس سے بہتر دے دے کہ ہم اس کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ اسی طرح عذاب نازل ہوتا ہے اور آخرت کا عذاب تو اس سے بڑا ہے، اگر انھیں علم ہو۔ (قلم/۱۷ تا ۳۳)

اس قصے میں نفس انسانی کی متعدد حالتوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ خودی کی وہ صورت جہاں خدا کو نظر انداز کر دیا جائے۔

۲۔ خود غرضی کی وہ صورت جہاں دوسروں کو محروم رکھا جاتا ہے۔

۳۔ خود پسندی کی وہ صورت جہاں خود کو سب سے بڑا طاقتور سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ افسردگی اور پریشانی کی وہ حالت جہاں انسان خود کو لاچار و ناتواں سمجھے۔

۵۔ تواضع و انکساری کی وہ حالت جہاں انسان خدا کی طرف پلٹ آئے اور مشیت الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

ضرب المثل قرآن کی روشنی میں

قرآن میں ضرب المثل کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ وہ ضرب المثل جن میں قوت تخیل کے ذریعہ اچھے برے افراد یا گروہوں کے حالات وصفات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس طرح کی ضرب المثل کو اصطلاحاً "تمثیل" کہتے ہیں جس کی تفصیلی بحث گذر چکی ہے۔

۲۔ وہ ضرب المثل جن میں گذشتہ قوموں کے واقعات اور انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو بیان کر کے آنے والی نسلوں کو درس عبرت دیا گیا ہے۔ اس قسم کی ضرب المثل خیال اور مفروضوں کے بجائے حقائق وسچائیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ مثلاً:

"ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَأَةَ نُوحٍ وَّامْرَأَةَ لُوْطٍ، وَّضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا امْرَأَةَ فِرْعَوْنَ، وَمَرْيَمَ ابْنَةَ عِمْرَانَ" (تحریم/۱۰تا۱۲)

خدا نے ان آیات میں دو اچھی اور دو بری عورتوں کو مثال اور نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے تا کہ وہ لوگ متوجہ ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں جن کا گمان ہے کہ انسان اچھائی اور برائی کے معاملہ میں بے دخل ہے، وہ فقط ماحول کا تابع ہے فکر وعمل کے اعتبار سے اپنے سماج کا اسیر ہوتا ہے۔ جس طرف سماج جا رہا ہو، یہ بھی اسی سمت حرکت کرنے پر مجبور ہے، جب کہ یہ نظریہ سراسر باطل ہے۔ چونکہ انسانوں کے ذریعہ سماج وجود میں آتا ہے نہ کہ سماج کے ذریعہ انسان۔ انسان کو جو چیز بناتی اور بگاڑتی ہے وہ اس کا اپنا ارادہ اور عمل ہے۔ (یہ بحث قصص قرآنی سے مربوط ہے اور ہم وہاں کافی حد تک اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔)

۳۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کے قالب میں ضرب المثل بیان کرنا۔ ان جملوں کا پس منظر

نہایت دلچسپ اور عبرتناک ہوتا ہے۔ اس طرح کی ضرب المثل ہر زبان اور ملک میں بے شمار رائج ہیں۔

البتہ قرآن مجید نے عرب میں رائج کسی بھی ضرب المثل کو اپنے دامن میں جگہ نہیں دی، جبکہ قرآن مجید کی بہت سی ضرب المثل عربی زبان میں آج تک رائج ہیں۔ قرآن کریم سے ماخوذ ضرب المثل کبھی صریح ہوتی ہے اور کبھی ضمنی ہوا کرتی ہیں بطور نمونہ کچھ مثالیں بیان کئے دیتے ہیں:۔

۱۔ "وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ" (فاطر/۴۳)

بری چالیں چالباز ہی کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔

۲۔ "اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا" (اسراء/۷)

اچھائی کرو گے تو اپنے لئے برائی کرو گے تو اپنے لئے۔

۳۔ "وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى" (نجم/۳۹)

اور انسان کے لئے بس اتنا ہی ہے، جتنی اس نے کوشش کی ہے۔

۴۔ "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى" (انعام/۱۶۴)

کوئی بھی انسان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

۵۔ "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (کافرون/۶)

تمہارا دین تمہیں مبارک ہو اور ہمارا دین ہمیں۔ (عیسیٰ بہ دین خود موسیٰ بہ دین خود)

۶۔ "كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ"

ہر گروہ جو کچھ اس کے پاس ہے، اس میں مست ومگن ہے۔ (روم/۳۲)

۷۔ "اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ" (نور/۲۶)

خبیث چیزیں خبیث لوگوں کے لئے ہیں اور پاک چیزیں پاک لوگوں کے لئے۔

کبوتر با کبوتر باز با باز کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

۸۔"مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ"

پیغمبر کی ذمہ داری صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔ (مائدہ / ۹۹)

۹۔"جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا"

برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔ (شوریٰ / ۴۰)

۱۰۔"وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذَالِكَ قَوَامًا"

(فرقان / ۶۷)

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں، نہ کنجوسی بلکہ درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں۔

۱۱۔"وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا" (اسراء / ۲۹)

اور خبردار! نہ اپنے ہاتھوں کو گردنوں سے بندھا ہوا قرار دو اور نہ بالکل پھیلا دو کہ آخر میں قابل ملامت اور خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ۔

ان آیتوں سے دو مقولہ نکالے جا سکتے ہیں:

۱۔"خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَاطُهَا"

(ہر کام میں درمیانہ راستہ ہی سب سے اچھا ہوتا ہے)

۲۔"اَلْجَاهِلُ اِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ"

(جاہل یا افراط کا شکار ہوتا ہے یا تفریط کا)

۱۲۔ وَ اِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ" (بقرہ/۲۶۰)

اور اس موقع کو یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ نے التجا کی کہ پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوا کیا تمہارا ایمان نہیں ہے؟ عرض کی ایمان تو ہے لیکن اطمینان چاہتا ہوں۔

مذکورہ آیات سے مندرجہ ذیل مقولے اخذ کئے گئے ہیں:

۱۔"لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْعَيَانِ"

۲۔"سنی سنائی بات اور ہے آنکھوں دیکھی بات اور ہے"

۳۔"شنیدن کے بود مانند دیدن"

۱۳۔وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً"

اور جو بھی راہ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور وسعت پائے گا۔ (نساء/۱۰۰)

"اَلْحَرْكَةُ تَجْلِبُ الْبَرْكَةَ"

حرکت میں برکت ہے، یہ ضرب المثل اسی آیت سے ماخوذ ہے۔

سوالات

۱۔ تمثیل کی تعریف کرتے ہوئے اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالئے۔

۲۔ قرآنی تمثیلات خیالی ہے یا حق بیانی ہے اس بیان کی مثالوں سے تشریح کیجئے۔

۳۔ قرآن کریم میں کتنی طرح سے کفار کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

۴۔ ''وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ'' (سورۂ کہف/۴۵)
اس آیت میں دنیاوی زندگی کی وضاحت کس طرح ہوئی ہے؟

۵۔ قرآن کریم سے کوئی پانچ ضرب المثل بیان کیجئے۔

انیسواں سبق

قرآن کا اعجاز

اعجاز مادۂ ''عجز'' یعنی ناتوانی سے ماخوذ ہے۔ اعجاز کا مطلب ہوتا ہے دوسروں کو ناتواں اور کمزور کرنا۔ دوسرے کو ناتواں کرنا دو طرح سے ممکن ہے: ایک تو یہ کہ اس کی طاقت سلب کر کے مجبور اور ناتواں بنا دیا جائے مثلاً کوئی شخص کسی کے مال و منصب کو زبردستی چھین کر اسے فقیر و لاچار بنا دے اور دوسرے یہ کہ انسان کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جسے انجام دینے سے دوسرے لوگ عاجز ہوں جب کہ اس کام کے انجام دینے پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہ ہو۔

انبیاء کے اعجاز کا تعلق دوسری قسم سے ہے یعنی جو عظیم کارنامے وہ کر دکھاتے ہیں انسانیت اسے انجام نہیں دے سکتی کیونکہ یہ کارنامے عام اور ظاہری اسباب و علل کے دائرے سے خارج ہوتے ہیں اور طبیعی اصول و ضوابط کے تحت ان تک رسائی ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے معجزہ کو ''خارق العادہ'' کہا جاتا ہے یعنی خلاف عادت و طبیعت۔ خلاصہ یہ کہ جس کام کو موجودہ نظام کائنات اور اس کے ظاہری اسباب و علل کے ذریعہ انجام نہ دیا جا سکے اسے معجزہ کہتے ہیں۔

معجزہ کی ضرورت

پیغمبروں کے ذریعہ انسانوں تک پہنچنے والے آسمانی قوانین اور پیغامات وہ روشن اور واضح حقائق ہوتے ہیں جنہیں ہر پاکیزہ فطرت پس و پیش کے بغیر قبول کر لیتی ہے۔ انبیاء کی ہر بات نہایت معقول اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

"و با لحق انزلناہ وبالحق نزل ..."

"ہم نے قرآن کو جو کہ عین حقیقت ہے نازل کیا اور قرآن اسی طرح نازل ہوا۔"

(اسراء/۱۰۵)

اسی وجہ سے قرآن میں بار بار اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ صاحبان عقل وخرد بے جھجک دعوت حق پر لبیک کہتے ہیں اور اسے دل وجان سے قبول کر لیتے ہیں۔

"وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ..."

"اور اس لئے کہ صاحبان علم کو معلوم ہو جائے کہ یہ وحی پروردگار کی طرف سے برحق اور اس طرح وہ ایمان لے آئیں اور پھر ان کے دل خدا کی بارگاہ میں عاجزی کا اظہار کریں۔" (حج/۵۴)

لیکن جو لوگ اپنے ذاتی فائدوں کو حق سے ٹکراتا دیکھتے ہیں اسے قبول نہیں کرتے اور اس سے مقابلہ پر تل جاتے ہیں اگر چہ ان کے دل بھی وحی الٰہی کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

"وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا"

"ان لوگوں نے ہماری نشانیوں کو ظلم اور غرور کی خاطر زبان سے جھٹلایا لیکن ان کے دلوں کو پورا پورا یقین تھا۔" (نمل/۱۴)

قرآنی منطق کی رو سے باطل نے خودنمائی سے کام لیا جب کہ حق ہمیشہ آشکار رہا ہے اور حق پرستوں کے لئے خود حق ہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ حق کو قبول کرنے کے لئے انہیں کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے کہ حق خود ہی واضح اور آشکار ہوتا ہے جسے پاکیزہ فطرت بلا جھجک تسلیم کر لیتی ہے۔ پیغمبران خدا کی سیرتیں اور قرآن کی آیتیں گواہ ہیں کہ انبیاء الٰہی نے ہمیشہ منکرین حق کے اصرار اور ان کے شکوک وشبہات کو زائل کرنے کی خاطر معجزہ دکھایا ہے، ورنہ کسی بھی پیغمبر نے اپنی دعوت کا آغاز معجزہ دکھا کر نہیں کیا۔ چونکہ ان کا پیغام عین حق ہوتا ہے اسے فطرت انسانی

اور عقل بشری خود بخود قبول کر لیتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ انبیاء نے اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے معجزہ نہیں دکھایا بلکہ قبول حق کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے اس طاقت کا استعمال کیا یعنی معجزہ تبلیغ دین کا ذریعہ نہیں، بلکہ ایک دفاعی وسیلہ ہے۔ (علوم قرآنی ۳۴۵ تا ۳۵۰)

زندۂ جاوید معجزہ

انبیاء خدا اپنے زمانے کے لوگوں کی سطح عقلی اور عصری فنون وکمالات کے اعتبار سے معجزہ دکھاتے رہے۔ جیسے جیسے انسانیت علم وتمدن کے اعتبار سے ترقی کرتی گئی، انبیاء کے معجزے بھی اسی لحاظ سے دقیق، سخت اور نازک ہوتے گئے۔ قرآن کریم آخری معجزہ الٰہی ہے اور دوسرے نبیوں کے معجزوں کی بہ نسبت سب سے بڑا، سب سے دقیق ومشکل اور نازک ترین معجزہ ہے۔

قرآن کریم مناسب ترین اسلوب، موثر ترین زبان وبیان اور محکم ترین مطالب کے ساتھ ان اہل عرب کے سامنے پیش ہوا جو کمال زبان وبیان میں انفرادی حیثیت کے مالک تھے۔ اسی وجہ سے جب انھوں نے اپنے کو قرآن کی فصاحت وبلاغت کے سامنے عاجز پایا تو اسے انسانی کلام سے بالاتر کلام تسلیم کر لیا۔ (انبیاءؑ کے معجزے ان کے دور کے ماہر ترین صاحبان علم وفن کی طاقت سے باہر ہوتے تھے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ معجزے انسانی طاقت سے باہر تھے۔ ان میں کوئی جادو ٹونا، بازی گری یا فریب کاری نہیں تھی۔ یہ عین حقیقت تھے۔)

ولید بن مغیرہ مخزومی جو ایک بلند پایہ خطیب اور عرب کا نامی گرامی سردار اور پیغمبر اسلام کا بدترین دشمن تھا وہ قرآن مجید کے سلسلہ میں "ابن ابی کثیر (ابو کثیر کا تعلق قبیلۂ خزاعہ سے تھا۔ یہ دین و مذہب کے اعتبار سے قریش کے مخالف تھے، کہا جاتا ہے کہ یہ پیغمبر اسلامؐ کے نانا تھے اسی وجہ سے کفار قریش آپ کو ابن ابی کثیر کہا کرتے تھے۔) جس کلام کی تلاوت کرتا ہے خدا کی قسم وہ نہ تو شعر ہے

نہ جادو نہ ہی پرانی خرافاتی داستان، بلاشبہ وہ اللہ کا کلام ہے۔"

یہی ولید ایک مرتبہ رسول اکرمؐ کے پاس سے گذر رہا تھا، آنحضرت نماز کے دوران سورہ مومن کی تلاوت میں مشغول تھے۔ ولید نے کچھ آیتیں سننے کے بعد کہا: "خدا کی قسم میں نے محمدؐ کی زبانی وہ کلام سنا جو نہ انسانوں کا کلام ہے اور نہ پریوں کا۔ خدا کی قسم اس کلام میں ایک خاص قسم کی کشش اور حلاوت ہے۔ یہ ایک بلند و بالا اور تناور درخت کے مانند ہے جس کی بلندی ثمر بخش اور سودمند ہو اور جس کی جڑ مضبوط، مستحکم اور پھیلی ہوئی ہو۔ یہ کلام یقیناً دوسرے کلاموں پر فوقیت حاصل کرلے گا اور دوسرے کلام کبھی بھی اس پر برتری نہ پاسکیں گے۔ (تفسیر طبری ج/۲۹ ص/۹۸ عرب کے ماہرین فن کی زبانی اس طرح کے بے شمار اعترافوں کو ماننے کے لئے علوم قرآنی ص/۳۵۲ تا ۳۵۶ اور "التمہید" کی چوتھی جلد کا مطالعہ کیجئے)

قرآن کریم کی یہ عظمت و بلندی چاہے نظم و ترتیب ہو یا وہ مضمون و مطالب میں ہو ہر اعتبار سے آج تک قائم ہے اور ابد تک برقرار رہے گی۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے فصاحت و بلاغت، مطالب کی پختگی، بیان کی سلاست و سادگی، معارف الٰہی اور احکام خداوندی کے سلسلہ میں بے پناہ جدت و خلاقیت اور دوسری بہت سی خصوصیتوں میں اس منزل کمال تک پہنچا ہوا ہے جہاں تک انسانیت اپنی آخری حد تک کوشش و ترقی کر لینے کے بعد بھی پہنچنے سے قاصر رہے گی۔ اسی لئے قرآن مجید کو زندۂ جاوید معجزہ یعنی ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ کہا جاتا ہے اور یہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی اسی اعجازی حالت پر شریعت اسلامی کے لئے سند اور ثبوت کے طور پر باقی رہے گا۔

قرآن مجید کا چیلنج

عربی زبان میں چیلنج کو "تحدی" کہتے ہیں۔ جس کا مطلب ہوتا ہے مثل، مانند اور مقابل کا مطالبہ کرنا۔ قرآن نے بار بار اپنے اعجازی پہلو کو اجاگر کیا ہے اور صراحت کے ساتھ حق کے

منکروں کو مقابلے کی دعوت دی ہے۔

"اگر اس قرآن کے کلام خدا ہونے میں شک کر رہے ہو، تو ٹھیک ہے، قرآن کلام خدا ہے یا نہیں اس کو جاننے کا بالکل آسان راستہ یہ ہے کہ بڑے سے بڑے سخنوروں اور ماہرین فصاحت و بلاغت کو دعوت دو کہ وہ اپنی ساری توانائیوں کو بروئے کار لاکر قرآن ہی کی طرح جاذب، دلکش، پختہ اور حکیمانہ کلام پیش کردیں۔ اگر تم لوگ ایسا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ اللہ کا کلام نہیں ہے اور اگر ایسا نہ کرسکے (کہ ہرگز ہرگز ایسا نہ کرسکو گے کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ انسانی کلام سے مافوق ہے) تو پھر قرآن کو اللہ کا کلام تسلیم کرلو۔"

کسی بھی کلام کے محاسن و معایب (اچھائیاں اور خرابیاں) پہچاننے کے لئے علماء بیان نے کچھ معیار بنائے ہیں۔ انہی کے سہارے کلام کے خوب و بد اور بلند و پست ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ مثلاً دو قصیدوں یا دیگر اصناف کے ادب کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنے کے بعد ایک کی بہتری بآسانی واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح کے موازنوں کی بنیاد قوت بیان، بلاغت کلام اور دیگر ادبی باریکیاں اور لطافتیں ہی ہوا کرتی ہیں۔ ادبی نشستوں اور فنی مقابلوں کی بنیاد انہی معیاروں پر قائم ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شخص کا کلام اس کے ذاتی تأثرات اور باطنی یعنی نفسیاتی کیفیات کی تخلیق ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی دوسرا شخص بالکل ویسا ہی کلام نہیں پیش کرسکتا۔ تحدی اور چیلنج کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انداز بیان، اسلوب کلام اور تشبیہ و استعارہ و کنایہ وغیرہ کے اعتبار سے ایسا کلام پیش کردیا جائے جو بالکل قرآن ہی جیسا ہو کیونکہ اس طرح کی مماثلت صرف تقلید ہی کے راستہ سے ممکن ہوسکتی ہے۔ (جیسے مسیلمۂ کذاب وغیرہ نے یہ تقلیدی کام کرکے دنیا و آخرت میں اپنے آپ کو رسوا کر ڈالا۔ (التمہید ج/۴، ص/۲۹۷۔۲۲۸)

بلکہ تحدی اور چیلنج کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کلام معرض وجود میں لایا جائے جو معنویت کے اعتبار سے قرآن ہی کی طرح بلند و بالا ہو اور فصاحت و بلاغت کی آخری منزل پر فائز ہو۔

چیلنج کے مرحلے

قرآن مجید نے منکرین حق کو کئی مرحلوں میں چیلنج کیا ہے کہ وہ قرآن جیسا کلام لے آئیں:

۱۔ پہلے مرحلہ میں بطور مطلق قرآن جیسا کلام پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

"فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ"

"اگر یہ اپنی بات میں سچے ہیں تو یہ بھی ایسا ہی کوئی کلام لے آئیں۔" (طور/۳۴)

۲۔ دوسرے مرحلے میں قرآن کے مانند دس سوروں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ چاہے وہ قرآن کے سب سے چھوٹے سوروں ہی جیسے کیوں نہ ہوں "اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن بندے نے گڑھ لیا ہے تو کہہ دیجئے کہ اس کے جیسے دس سورہ گڑھ کر تم بھی لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جس کو چاہو اپنی مدد کے لئے بلالو اگر تم اپنی بات میں سچے ہو۔" (ہود/۱۳)

۳۔ اس مرحلے میں قرآن مجید کے مخالفوں کی عاجزی اور کمزوری کو مزید واضح کرنے کے لئے صرف ایک ہی سورہ کا مطالبہ ہو رہا ہے: "اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"

"کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے پیغمبرؐ نے گڑھ لیا ہے تو کہہ دیجئے کہ تم اس کے جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ اور خدا کے علاوہ جسے چاہو اپنی مدد کے لئے بلالو اگر تم اپنے الزام میں سچے ہو۔" (یونس/۳۸)

۴۔ اور اب آخری بار بڑے ہی شد و مد اور زور و شور کے ساتھ منکرین حق کی بے بسی اور عاجزی کا اعلان ہوتا ہے: "وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ،

"اگر اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کا جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جتنے تمہارے مددگار ہیں سب کو بلالو، اگر تم اپنے دعوے اور خیال میں سچے ہو، اور اگر تم ایسا نہ کر سکے اور یقیناً نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جسے کافرین کے لئے مہیا کیا گیا ہے۔" (بقرہ/۲۳ تا ۲۴)

اس آیت میں پتھر کے ساتھ انسانوں کا تذکرہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بے شعور اور عقل و خرد سے بے بہرہ افراد پتھروں کے مانند ہیں اور آخرت میں بھی جہنمی پتھروں کے ساتھ آتش جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

۵۔ اس مرحلے میں اللہ نے ہمیشہ کے لئے جن و انس کو چیلنج کر کے قرآن کے معجزہ ہونے کا اعلان فرمادیا: "قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا"

"آپ کہہ دیجئے اگر انسان اور جنات سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس کا مثل لے آئیں تو بھی نہیں لا سکتے، چاہے سب ایک دوسرے کے مددگار اور پشت پناہ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔" (اسراء/۸۸)

مندرجہ بالا آیات میں خصوصاً آخری دو آیتوں میں بڑے دلچسپ نکات پائے جاتے ہیں جو معجزے کی حقیقت کو بخوبی واضح کر دیتے ہیں۔ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۴ میں بطور مطلق آئندہ زمانے کے حالات بیان کر دیئے ہیں: "وَلَنْ تَفْعَلُوْا" یعنی ابد تک قرآن کا مثل لانا ناممکن ہے۔ اسی طرح سورۂ اسراء آیت نمبر ۸۸ میں بھی تمام اہل عالم کو قرآن کا مثل لانے سے عاجز بتایا گیا ہے۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں "عالم الغیب والشہادۃ" پروردگار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا، اس لئے کہ کوئی بھی صاحب کمال اور فن کار اپنے کمال یا فن کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اپنے ہم عصر لوگوں کو چیلنج کر سکتا ہے کیونکہ انسان صرف اپنے زمانے کے لوگوں کو پہچانتا اور ان کی صلاحیتوں سے آگاہ ہو سکتا ہے۔

چونکہ انسان مستقبل کے لوگوں اور تمام اہل عالم کو نہیں جانتا، لہٰذا ہوش وحواس صحیح ہونے کی صورت میں وہ ان افراد کو چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا، لیکن قرآن کریم نے نہایت جرأت وہمت کے ساتھ قرآن کے مقابلے میں دنیائے انسانیت بلکہ جن وملک سمیت تمام کائنات کی عاجزی اور کمزوری کا اعلان کر دیا۔ خود یہی جرأت وہمت قرآن کے معجزہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

سوالات

۱۔ معجزہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کی قسمیں لکھئے۔ اور بتایئے کہ اعجاز قرآن کس قسم سے ہے؟

۲۔ قرآن کس کس لحاظ سے معجزہ ہے؟

۳۔ تحدی کی تعریف کیجئے۔

۴۔ ''قرآنی تحدی'' کے مرحلے بیان کیجئے۔

۵۔ قرآن کے معجزہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل کیا ہے؟ وضاحت کیجئے۔

بیسواں سبق

اعجاز قرآن کے مختلف پہلو (۱)

علماء اور صاحبان فکر ونظر نے اعجاز قرآن کے بارے میں بہت ہی تفصیل سے بحثیں کی ہیں، بے شمار مطالب پیش کئے ہیں۔ البتہ اس موضوع کے سلسلہ میں نظریاتی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ پہلے کے علماء نے ایک انداز سے سوچا ہے اور آخر کے علماء نے کسی اور رخ سے غور وفکر کر کے گذشتہ علماء کے اقوال میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے۔ (علوم قرآنی، ۲۵۶ تا ۲۶۷)

دور حاضر میں اعجاز قرآن کے موضوع پر تین اہم اور بنیادی پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے:۔

اعجاز بیانی، اعجاز علمی اور اعجاز تشریعی۔

سردست ہم قرآن کی اعجاز بیانی کی وضاحت کر رہے ہیں۔ اعجاز علمی اور اعجاز تشریعی کی وضاحت اگلے سبق میں ہوگی۔

ا۔ اعجاز بیانی

اعجاز بیانی قرآن کریم کے لفظوں، جملوں اور ترکیبوں میں پوشیدہ باریکیوں اور بلاغت کے نکات ہیں جب کہ یہ باریکیاں اور نکات معنی اور مفہوم میں بھی اصلی رول ادا کرتے ہوں۔

قرآن کے اعجاز بیانی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(الف) الفاظ کا انتخاب

قرآن مجید میں استعمال شدہ حروف، الفاظ اور عبارتیں نہایت منظم اور مبہم رہ گئی ہے کہ قتل

کس چیز سے زیادہ قتل کے روک تھام کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (اگر مفضل علیہ یعنی جس چیز پر برتری دی گئی ہے، اسے مقدر مانیں تو وہ شے مقدر یا "مِنْ کُلِّ شَیْئٍ" ہوگی یعنی قتل ہر چیز سے زیادہ قتل سے روکنے والا ہے، تو یہ بات قطعاً صحیح نہیں ہے یا مقدر "مِنْ بَعْضِ الْاَشْیَاءِ" ہوگا یعنی قتل کچھ چیزوں سے زیادہ قتل کی روک تھام کر سکتا ہے تو وہ بعض چیزیں کیا ہیں؟ یہ بات مبہم ہے۔)

۳۔ آیۂ قصاص میں مثبت پہلو پایا جاتا ہے جبکہ مذکورہ جملہ میں منفی پہلو نظر آتا ہے اور معیار کلام کی رو سے خصوصاً قانون سازی میں مثبت عبارت منفی عبارت پر فوقیت رکھتی ہے۔

۴۔ لفظ قصاص سے ذہن اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اس قانون کا سرچشمہ عدالت وانصاف ہے، جبکہ لفظ قتل سے دل میں نفرت اور بیداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ آیت میں صنعت طباق کے ذریعہ دو متضاد چیزوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے کہ قصاص جو قتل کی ایک قسم اور حیات کی ضد ہے، آیۂ مبارک میں اسے باعث حیات شمار کیا گیا ہے۔

لفظوں کے انتخاب کرنے میں قرآن مجید کی اس باریکی کے دو سبب ہیں:۔

(الف) لغات کے خصوصیات پر مکمل عبور اس طرح کہ ہر لفظ کے سارے معانی اور اس کے استعمال کے سارے طریقوں کو جانتا ہو۔

(ب) ہر وقت حاضر دماغ ہو تا کہ استعمال کے وقت سارے الفاظ اس کے پیش نظر ہوں اور بہتر سے بہتر الفاظ کے انتخاب میں اسے کوئی دشواری نہ ہو۔

انسانوں میں ان دونوں باتوں کا پایا جانا تقریباً ناممکن ہے۔

(ب) اسلوب بیان

حالانکہ قرآن مجید کا انداز بیان عرب میں رائج اسالیب کلام سے بالکل مختلف تھا مگر پھر بھی ان کی دلچسپی اور توجہات کا مرکز تھا۔

زبان وبیان کی فنی دنیا میں یہ بات بڑی عجیب وغریب ہے کہ کوئی اہل سخن ایسا کلام پیش

کرے جو سامعین کو پسند بھی ہو اور ان کے درمیان رائج اسالیب کلام سے جدا بھی ہو۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس کلام میں رائج اسالیب کی ساری خوبیاں موجود ہوں اور ان کی خامیاں بالکل ندارد ہوں۔

فصحائے عرب کے درمیان رائج اصناف سخن شعر، نثر اور سجع تھے۔

شعر وہ کلام ہے جس میں وزن و قافیہ اور تخیل ہوں۔

نثر بکھرا ہوا کلام ہے جس میں وزن وغیرہ نہ ہو۔

سجع قافیہ دار چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل کلام ہے جس میں کوئی خاص وزن اور نظم نہ ہوں۔

ان تینوں اصناف میں کچھ خوبیاں ہیں تو کچھ خامیاں بھی ہیں۔ قرآنی اسلوب بیان میں شعر کی دلکشی اور چاشنی تو ہے ہی مگر وہ قافیہ اور وزن کے بندھنوں سے آزاد ہے، نثر کی پوری پوری آزادی تو ہے مگر پراگندگی سے پاک ہے۔ سجع کی خوبصورتی اور لطافت تو ہے مگر تکلیف اور تصنع سے محفوظ ہے اور یہی چیز عرب کے بہترین فصاحت و بلاغت کے لئے حیرت و استعجاب کا باعث بنی ہوئی ہے۔

(ج) بے مثال آہنگ

قرآن مجید کی تلاوت سنتے وقت جو چیز سب سے پہلے انسان کو کھینچتی ہے، وہ قرآن مجید کا بے مثال ضائع و بدائع کا نظام اور صوتی آہنگ ہے۔ قرآن مجید میں الفاظ کے حرکات و سکنات اس طرح سجے سجائے ہیں کہ سنتے وقت اس کی دل نشینی کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔

یہ قرآن مجید کا نظم و آہنگ ہے جو دلوں کو اپنی طرف موہ لیتا ہے، انسان کے احساسات کو جلا دیتا ہے اور دلوں کو تازگی بخشتا ہے، تو روحوں کو نشاط و پاکیزگی۔ مثال کے طور پر سورۂ نجم کی کچھ آیتیں:۔

"وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى، مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى، عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى، وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى، ثُمَّ

دَنَا فَتَدَلّٰى، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى، فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ اَوْحٰى، مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى، اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَايَرٰى، وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى، عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى، اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَايَغْشٰى، مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى، لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى."

"قسم ہے ستارے کی جب وہ ٹوٹا تمہارا ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے اور نہ بہکا، اور وہ اپنی خواہش سے کلام بھی نہیں کرتا ہے، اس کا کلام وحی ہے جو مسلسل نازل ہوتی رہتی ہے، اس نہایت طاقت والے نے تعلیم دی ہے، وہ صاحب حسن و جمال جو سیدھا کھڑا ہوا، جبکہ وہ بلند ترین افق پر تھا، پھر وہ قریب ہوا اور آگے بڑھا، یہاں تک کہ ایک کمان یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا، پھر خدا نے اپنے بندے کی جانب جس راز کی بات کرنی چاہی وحی کر دی، دل نے اس بات کو جھٹلایا نہیں جس کو آنکھوں نے دیکھا، کیا تم اس سے اس بات کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہو جسے وہ دیکھ رہا ہے، اور اس نے تو اسے ایک بار اور بھی دیکھا ہے، سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک، جس کے پاس جنت الماویٰ بھی ہے، جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا، اس وقت اس کی آنکھ نہ بہکی اور نہ حد سے آگے بڑھی، اس نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں بھی دیکھی ہیں۔"

قرآن مجید کے دلکش اور دل آویز ہونے میں خوبصورت اور منظم الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے معانی و مطالب بھی بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

الفاظ سے قطع نظر قرآن مجید کے معانی و مفاہیم میں بھی ایک خاص قسم کا نظم و ضبط اور آہنگ پایا جاتا ہے جو قرآن مجید کے علاوہ کسی اور میں نہیں پایا جاتا ہے۔

الفاظ کے علاوہ قرآن کے معانی و مفاہیم میں بھی ایک خاص قسم کی موسیقیت اور نغمگی پائی جاتی ہے جس سے دنیا کا ہر کلام محروم ہے۔

(مزید معلومات کے لئے "علوم قرآنی" کے صفحہ/۳۸۰ تا ۳۹۱ کا مطالعہ کیجئے۔)

(د) وحدت موضوعی (معنی کے اعتبار سے آیتوں کا باہمی ارتباط)

قرآن مجید کی آیتیں اگرچہ مختلف موقعوں پر اور الگ الگ نازل ہوئی ہیں لہٰذا اصولاً ان کے درمیان آپس میں تناسب، ارتباط اور ہم آہنگی نہیں ہونی چاہئے لیکن ہر سورہ کے موضوع اور نفس مضمون کے بارے میں عصر حاضر کے فاضلین کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ہر سورہ میں ایک یا ایک سے زیادہ اہداف پائے جاتے ہیں۔ اس سورہ کی ساری آیتیں اس ہدف تک پہنچانے کا وسیلہ ہیں۔ قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا راز بھی یہی ہے کہ ایک سورہ کی وہ آیتیں جو الگ الگ موقعوں پر نازل ہوئیں سب آپس میں مربوط، متصل اور ہم آہنگ ہیں۔ دور حاضر کی زبان میں اس اتحاد اور باہمی ارتباط کو "وحدت موضوعی" کہا جاتا ہے۔

خصوصی توجہ

بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ ایک سورہ کی ساری آیتوں کی طرح قرآن مجید کے سارے سوروں میں بھی ارتباط پایا جاتا ہے، یعنی سوروں کی ترتیب بھی ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ کچھ لوگوں نے تو اسے قرآن مجید کے معجزہ ہونے کی دلیل بھی تسلیم کرلیا ہے۔ (تفسیر نوین ص/۱۹تا۲۰)

جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور یہ نظریہ سراسر باطل ہے سوروں کے درمیان معنی کے اعتبار سے آپس میں کوئی ارتباط نہیں پایا جاتا کیونکہ سوروں کی ترتیب توقیفی نہیں ہے یعنی اللہ اور رسول کی طرف سے نہیں ہے بلکہ وفات رسولؐ کے بعد صحابہ کے ذریعہ عمل میں آئی ہے۔ اس ترتیب میں عام طور پر سوروں کے چھوٹے اور بڑے ہونے کو معیار قرار دیا گیا ہے۔ بڑے سوروں کو پہلے رکھا گیا ہے اور چھوٹے سوروں کو بعد میں۔

(ھ) اہم نکات

قرآن مجید میں استعارہ، کنایہ، تشبیہ، مجاز اور دوسری ادبی صنعتیں کافی استعمال کی گئی

ہیں۔ ان سب میں عربی زبان کے اصول وقواعد کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، لیکن ان صنعتوں کے استعمال کا انداز اور موقع ومحل اتنا متناسب اور موزوں ہے کہ انھیں دیکھنے کے بعد عربی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھنے والے ماہرین زبان وبیان بھی حیرت میں پڑ گئے ہیں اور اس حقیقت کا اعتراف کرلیا ہے کہ قرآن مجید کی جیسی تشبیہیں اور دوسری صنعتیں کلام میں تصور بھی نہیں کی جاسکتیں۔

عرب نامی گرامی ادیب ابن اثیر تشبیہ کے لئے آیۂ مبارکہ "وجعلنا اللیل لباسا" کو بطور مثال پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ رات کو لباس سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح کپڑا انسان کے بدن کو چھپالیتا ہے اسی طرح رات بھی ہر چیز پر پردہ ڈال دیتی ہے کہ اگر کوئی شخص بھاگنا چاہے یا کسی کی گھات میں بیٹھنا چاہے یا کسی چیز کو چھپانا چاہے تو رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ تشبیہ سب سے پہلے قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہے، قرآن سے پہلے عرب کے نثر ونظم کا دامن اس تشبیہ سے خالی تھا۔ (المثل السائر، ج/۲، ص/۱۲۶تا۱۳۵)

سوالات

۱۔قرآن کے اعجازی پہلوؤں کی نشاندہی کیجئے۔

۲۔قرآن کے حروف والفاظ کے انتخاب میں کن کن نکتوں کالحاظ رکھا گیا ہے؟

۳۔قرآن کا اسلوب بیان عرب میں رائج اسالیب بیان پر کیا امتیازات رکھتا ہے؟

۴۔قرآن کی وحدت موضوعی کا مطلب بتاتے ہوئے واضح کیجئے کہ کیا سوروں کے درمیان میں معنوی ارتباط پایا جاتا ہے؟

اکیسواں سبق

اعجاز قرآن کے مختلف پہلو (۲)

جیسا کہ پچھلے سبق میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ اعجاز قرآن کے تین پہلو ہیں:

۱۔اعجاز بیانی ۲۔اعجاز علمی ۳۔اعجاز تشریعی

۱۔اعجاز بیانی کی وضاحت پچھلے سبق میں ہو چکی ہے۔یہاں اعجاز کے دوسرے دو پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے ہیں۔۲۔اعجاز علمی اس سے مراد قرآن مجید کے وہ علمی اشارے ہیں جو کہ آیتوں میں پائے جاتے ہیں۔قرآن کا اصل مقصد علمی مسائل کا بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ قرآن انسانی ہدایت کی کتاب ہے۔اس کا اصل مقصد انسانی زندگی کو سیدھے راستے پر لگانا ہے۔اور دنیا و آخرت کی خوشبختی سکھانا ہے، نہ کہ علمی مسائل کا بیان کرنا۔پھر بھی اگر قرآن کریم میں علمی اشارے پائے جاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم براہ راست علم الٰہی کے سرچشمہ اور حکمت ربانی کے خزانہ سے جڑا ہوا ہے۔

"قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

''اے رسول کہہ دیجئے: قرآن مجید کو اس خدا نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے رازوں سے باخبر ہے۔'' (فرقان/۶)

قرآن میں بے شمار علمی اشارے موجود ہیں جن میں سے کچھ بہت پہلے سے آشکار ہیں اور کچھ گذشتہ چند سالوں میں علم اور ٹیکنالوجی کی ترقیوں کے بعد آشکار ہوئے۔اور بہت سے آئندہ زمانے میں جیسے جیسے علم اور سائنس کو ترقی ہوگی اجاگر ہوتے جائیں گے۔

اس سلسلہ میں عصر حاضر کے دانشوروں نے کافی زحمتیں کی ہیں جن میں بہت سے کامیاب

بھی ہوئے ہیں جبکہ دوسروں نے غلطیاں کی ہیں۔

علمی اشاروں کے بہت سے نمونے ہم نے "التمہید، ج/۶" اور "علوم قرآنی" میں اعجاز علمی کے زیر بحث بیان کئے ہیں۔ اختصار کے پیش نظر یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کر رہے ہیں:

(الف) اونچائی میں سانس لینے میں دشواری

"...وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ"

"اور اللہ جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو ایسا تنگ اور دشوار گذار بنا دیتا ہے کہ جیسے وہ آسمان میں فضا کے درمیان معلق ہو۔" (سورۂ انعام/۱۲۵)

اس آیت میں اللہ نے گمراہوں کی مثال اس شخص سے دی ہے جو فضا میں معلق ہونے کی وجہ سے سخت دشواری اور سانس کی تنگی میں گرفتار ہو۔

پہلے کے مفسرین نے اس تشبیہ کے سلسلہ میں مختلف نظریات پیش کئے۔ کچھ کا نظریہ یہ تھا کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو پرندوں کی طرح آسمان میں اڑنے کی ناکام کوشش کرتے کرتے آخر کار اتنا تھک جاتا ہے کہ سانس کی تنگی اور سینے کی گھٹن میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کچھ کا کہنا تھا کہ اس سے مراد چھوٹے چھوٹے پودوں کی حالت زار ہے کہ وہ گھنے جنگلوں میں اوپر نکلنا چاہتے ہیں تو پرانے اور گھنے درخت ان کا راستہ روک دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں ننھے پودوں کو پنپنے اور آزاد فضا میں پہنچنے کے لئے بے پناہ زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں اسی طرح کی اور بھی بہت سی باتیں کی جاتی تھیں۔ جن میں سے کوئی بھی بات آیت کے مفہوم کو واضح کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔

آج جب ہوا کہ دباؤ (پریشر) کا انکشاف ہوا اور کرۂ زمین پر آباد انسانوں کے بلڈ پریشر سے اس کا ہم آہنگ اور متناسب ہونا معلوم ہوا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ جیسے جیسے انسان اوپر کی سمت بڑھتا جائے گا، ہوا کا دباؤ کم ہوتا جائے گا۔ اس وجہ سے اگر حفاظتی اشیاء کا بندوبست نہ ہو تو انسان کا

بلڈ پریشر بھی low ہوتا جائے گا۔ جس کے نتیجہ میں وہ سانس کی پریشانی، سینہ میں گھٹن اور دوسرے مشکلات کا شکار ہو جائے گا۔ ان معلومات کے نتیجہ میں آیت کی تفسیر بہتر سے بہتر طور پر واضح ہو گئی اور سارے شبہات یکے بعد دیگرے دور ہو گئے۔

پہلے کے مفسرین نے "يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ" کا مطلب نکالا تھا "آسمان کی طرف بڑھنے کی کوشش" اس کے نتیجہ میں کچھ مفسرین اس آیت کا مصداق ہوائی سفر کی کوشش کرنے والے انسانوں کو قرار دے دیا، تو کچھ نے جنگلی پودوں کو اس کا مصداق مان لیا جب کہ "يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ" کا اگر وہی مطلب ہوتا جو مفسرین نے سمجھا تھا تو اس جملہ میں "فِيْ" کے بجائے "اِلٰی" کا لفظ استعمال ہونا چاہئے تھا۔ اور دوسرے کہ "يَصَّعَّدُ" لغوی اعتبار سے اوپر چڑھنے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دشواری اور مصیبت میں گرفتار ہونا ہے۔ اس کا اصل معنی ہے "تَصَّعَّدُ نَفْسُهٗ" کا مطلب ہوتا ہے دشواری سے سانس لینا، سینے میں گھٹن اور درد و تکلیف محسوس کرنا۔

"صعود" اور "صعد" کا اطلاق بھی پہاڑوں کی نہایت دشوار گذار "صعب العبور" گھاٹیوں پر اور اسی طرح ہر دشوار اور انتہائی مشکل کام پر ہوتا ہے۔ سورۂ جن میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا"

"جو اللہ کی یاد سے منہ موڑے گا خدا اسے سخت اور دشوار عذاب میں مبتلا کر دے گا۔" (سورۂ جن/۱۷)

سورۂ مدثر میں بھی "صعود" اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا"

"میں اس کو سخت ترین عذاب میں گرفتار کروں گا۔" (سورۂ مدثر/۱۷)

ان ساری باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ جملہ آیت کے اس ٹکڑے "وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا" كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ" کا صحیح مطلب ہوگا کہ اللہ جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو یوں تنگ کر دیتا ہے کہ جیسے وہ فضا میں معلق ہو، اسے سانس لینے میں تکلیف اور سینے میں سخت گھٹن کا احساس ہو رہا ہو۔ جس حقیقت کا انکشاف آج کی ترقی یافتہ

دنیا سالہا سال کی زحمتوں اور تجربوں کے بعد کر سکی ہے، وہ چودہ سو سال پہلے سے قرآن میں موجود ہے۔ یہ قرآن مجید کا علمی معجزہ نہیں تو اور کیا ہے کہ اس زمانہ میں جب کوئی اس مسئلہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، قرآن اپنے دامن میں اسے محفوظ کئے ہوئے تھا۔

(ب) فضا میں زمین کی محافظ پرتیں (Layers)

"وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا وَّهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ"

"ہم نے آسمان کو (زمین کے اوپر) محفوظ چھت قرار دیا مگر پھر بھی لوگ ہماری نشانیوں سے منھ موڑ رہے ہیں۔" (سورۂ انبیاء/۳۲)

چاروں طرف سے ہوا کی ایک ضخیم اور موٹی پرت نے زمین کو اپنے دائرہ میں گھیر رکھا ہے۔ اس کی اونچائی تقریباً ۳۵۰ کلومیٹر تک پہنچتی ہے۔ اس ہوا کی پرت (Atmosphere) میں سے مختلف قسم کی گیسیں پائی جاتی ہیں جیسے نائٹروجن 78.03%، آکسیجن 20.99%، کاربن ڈائی اکسائڈ 0.4%، بھاپ اور اس کے علاوہ 0.94 دوسری گیسیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں۔ ہوا کی پرت زمین کو ایک مضبوط خول کے مانند ڈھانپے ہوئے ہے، اس میں موجود مختلف قسم کی گیسیں زمین کو ہر ممکنہ خطرے سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ مثلاً آسمان کی جانب روزانہ آنے والے بے شمار اور خطرناک پتھروں (ہر روز کئی لاکھ آسمانی (Meteorite) آسمانی پتھر زمین کی طرف گرتے ہیں۔) سے زمین اور اہل زمین کو بچائے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح سے زمین پر سکون کی زندگی بسر کرنے کا امکان فراہم کئے ہوئے ہے۔ اس موٹی پرت کے علاوہ ایک اور ہلکی سی پرت بھی زمین کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے جسے Ozone Layer یعنی اوزون پرت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ پرت جو بجلی کی چمک اور کڑک سے بنتی ہے، زمین کو الٹراوائلٹ (Ultra violet) وغیرہ جیسی خطرناک کرنوں سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اگر یہ اوزون کی پرت (Ozone Layer) نہ ہوتی تو زمین پر زندگی محال ہو جاتی۔ قرآن مجید نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس طرح کے علمی

نکات بیان کر کے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ایک الٰہی اور آسمانی کتاب ہے جو علیم، حکیم پروردگار کا ابد تک باقی رہنے والا زندۂ جاوید معجزہ ہے۔

۳۔ اعجاز تشریعی:۔ انسان ہمیشہ سے عالم ہستی اور راز خلقت سے متعلق اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے تسلی بخش جوابات ڈھونڈتا رہا ہے۔ انسان کہاں سے آیا ہے؟ اور اسے کہاں جانا ہے؟ اور اسی طرح کے دوسرے جواب تلاش کرنے میں انسان نے بری بڑی کوششیں کیں مگر سب بے فائدہ اور لاحاصل رہیں۔ انسان نے سوالات کی اس ڈور کو سلجھانے کی جتنی کوشش کی، یہ ڈور اتنی ہی الجھتی گئی۔ اس لئے کہ "وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا" "اسے جو علم دیا گیا ہے وہ بہت کم دیا گیا ہے۔" (سورۂ اسراء/۸۵)

البتہ دین اسلام میں ان سارے سوالوں کے تسلی بخش جوابات موجود ہیں۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں بھٹکے ہوئے افکار و نظریات اور سیدھے راستے پر لگایا جا سکتا ہے۔ اور انسانوں کا طے کیا ہوا ادھورا سفر بآسانی مکمل کیا جا سکتا ہے۔ "يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ"

"اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا کا سامان اور ہدایت اور صاحبان ایمان کے لئے رحمت (یعنی قرآن) آچکا ہے۔" (سورۂ یونس/۵۷)

دلوں کو شفا بخشنے کا مطلب یہی ہے کہ انسان کو اپنی گمشدہ چیز تلاش کرنے میں باطنی اور روحانی طور پر پہنچنے والے صدمے اور رنج و ملال سے قرآن مجید کے ذریعہ چھٹکارا مل سکتا ہے، اس لئے کہ وحی الٰہی کی تعلیمات اس طرح کے رنج و ملال کا علاج کرنے کے لئے بہترین نسخہ ہے، کیونکہ قرآن نے انسان کے سامنے وہی چیزیں پیش کی ہیں، جنہیں وہ خود تلاش کر رہا تھا مگر حاصل نہ کر سکا تھا۔

یہ خود قرآن کے معجزہ ہونے کی دلیل ہے کہ اگر اللہ کے فضل و کرم، لطف و عنایت کا انمول خزانہ یعنی قرآن مجید نہ آتا تو انسانیت کا یہ کارواں قطعاً منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس دور کے سب سے پچھڑے ہوئے قبیلے ہوں یا سب سے ترقی یافتہ متمدن معاشرہ ہوں عالم ہستی، آغاز خلقت اور کائنات کے دیگر اسرار و رموز کے سلسلہ میں ان کے نظریات حقیقت سے کوسوں دور اور خیالی تصورات کے مانند تھے۔

انبیاءؑ کی تعلیمات بھی زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ردوبدل اور تحریف کی نذر ہو چکی تھیں لہٰذا انسان کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اسے کہاں جانا ہے؟ یہاں تک کہ قرآن مجید نے انسان کو اس حیرانی و سرگردانی سے نجات دی اور سارے سوالات کے ٹھوس اور تسلی بخش جوابات مرحمت فرمائے۔

قرآن مجید نے عقائد اور احکام کو کما حقہ بیان کر کے ایک طرف انسان کو گندے اور خرافاتی افکار و نظریات سے بچالیا تو دوسری طرف عملی میدان میں حیرانی و سرگردانی سے نجات دے دی۔

الٰہی قوانین میں وہ امتیازات پائے جاتے ہیں جن سے بشری قوانین بالکل محروم ہیں:

۱۔ بھول چوک، غلطی اور ظلم و ستم کے امکان کا ہرگز ہرگز نہ پایا جانا جب کہ بشری قوانین میں یہ سارے امکانات بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔

۲۔ انسانی زندگی کے انفرادی، اجتماعی اور خدائی تینوں پہلوؤں کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہے۔ انسان اپنے ذاتی اور انفرادی حالات میں کیا کرے؟ اپنے سماج میں کیسے رہے؟ اور اپنے خدا سے کیسے رابطہ رکھے؟ اسلام میں ان تینوں پہلوؤں کو اس طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ ابہام اور شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی جب کہ بشری قوانین میں سارا زور صرف سماجی اور معاشرتی پہلو پر دیا گیا ہے، انفرادی پہلو پر نہیں کے برابر توجہ دی گئی ہے اور خدائی پہلو تو سرے ہی سے ندارد ہے۔ حالانکہ خدائی پہلو ہی انسانی زندگی کو نورانی اور بارونق بناتا ہے اور مادی چہار دیواریوں سے نکال کر عالم روحانی کی سیر کراتا ہے۔ عقائد اور احکام کے سلسلہ میں قرآن مجید کے معجزنمائی کی کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں۔

خدا کے صفات ثبوتیہ اور سلبیہ

قرآن مجید نے جگہ جگہ بہترین اور بے مثال انداز میں خدا کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ اسی کی ذات والا صفات ہر خوبی اور کمال کا مرکز قرار دیا ہے۔ اور ہر طرح کے عیب اور نقص سے منزہ اور پاک و پاکیزہ بتایا ہے۔ سورۂ حشر کی آخری آیتوں میں ارشاد ہوتا ہے:

"هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ، هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ"

"وہ خدا وہ ہے کہ جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے اور وہ حاضر و غائب سب کا جاننے والا عظیم اور دائمی رحمتوں کا مالک ہے، وہ اللہ وہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے وہ بادشاہ، پاکیزہ صفت، بے عیب، امان دینے والا، نگرانی کرنے والا، صاحب عزت، زبردست اور کبریائی کا مالک ہے، وہ ان تمام باتوں سے پاک و پاکیزہ ہے جو مشرکین کیا کرتے ہیں، وہ ایسا خدا ہے جو پیدا کرنے والا، ایجاد کرنے والا اور صورتیں بنانے والا ہے، اس کے لئے بہترین نام ہیں، زمین و آسمان کا ہر ذرہ اسی کے لئے محو تسبیح ہے اور وہ صاحب عزت و حکمت ہے۔" (سورۂ حشر/۲۲ تا ۲۴)

یہ خدا کے بارے میں قرآنی نظریات کا ایک نمونہ تھا جب کہ اسی کے برخلاف دوسری دینی کتابوں اور مذہبی رہبروں نے خدا کے بارے میں جو نظریات پیش کئے ہیں، وہ کسی بھی لحاظ سے بارگاہ الوہیت کے شایان شان نہیں ہیں۔ موجودہ توریت میں خدا کا وہ عجیب و غریب تصور پیش کیا گیا ہے جسے کوئی بھی صاحب عقل قبول نہیں کر سکتا:

"شہر بابل کی تعمیر کے موقع پر خدا کو یہ خدشہ محسوس ہوا کہ: اگر بہت سارے انسان اکٹھا ہو جائیں گے اور ایک مضبوط طاقت کی شکل اختیار کر لیں گے تو اس کی ربوبیت اور خدائی خطرہ میں پڑ

جائے گی چنانچہ جبرئیل کو حکم دیا کہ لوگوں کے مجمع کو منتشر کر دیں۔ (تورات، سفر پیدائش، باب یازدہم نمبر ۲۲ تا ۲۳)

یونان کی پرانی کہانیوں (My thology) میں بھی طرح طرح کے چھوٹے بڑے خداؤں کی جو مضحکہ خیز تصویر پیش کی گئی ہے اس کے ساتھ کچھ نمونہ مشہور تاریخ نگار ویل ڈورانٹ نے اپنی کتاب "تاریخ تمدن" میں نقل کیے ہیں۔ (تاریخ تمدن، ج/۲، ص/۱۹۷ کے بعد کا حصہ)

اسلامی احکام کی جامعیت

اسلامی احکام وقوانین میں جو جامعیت پائی جاتی ہے وہ کسی اور دین وشریعت یا مکتب فکر میں نہیں پائی جاتی ہے۔

عبادات، معاملات اور نظام حیات کے دوسرے شعبوں میں اسلام مستقل نظریہ کا مالک ہے اور ان مسائل کے سارے پہلوؤں کو باریک بینی سے مدنظر رکھ کر دنیا کے سامنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں اور عالم انسانیت کو مادی اور معنوی اعتبار سے فلاح وبہبود پانے کے لئے اپنی اطاعت کی طرف دعوت دی ہے۔

اسلامی عبادتیں روح کو سکون پہنچاتی ہیں اور خدا سے انسان کے رابطہ کو مضبوط بناتی ہے۔ یہ چیز خود بخود انسانی روح کو قوت اور پاکیزگی عطا کرتی ہے۔ خلوص نیت اور خضوع وخشوع کے ساتھ نماز کی ادائیگی، روزے کے ذریعہ خواہشات نفس سے مقابلہ کی طاقت کا حاصل ہونا اور اسی طرح دوسری بہت سی دعائیں اور واجب ومستحب عبادتیں اور خصوصاً انہیں مقدس مقامات پر انجام دینے کی تاکید، ان ساری باتوں سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ دین اسلام نے انسان کے نفس کی طہارت، باطنی پاکیزگی اور سماج کے حدود میں رہ کر مرحلۂ کمال تک پہنچنے کا منظم لائحۂ عمل پیش کیا ہے۔

قرآن مجید میں مختلف شکلوں سے استعمال ہونے والا لفظ "تزکیہ" خود بتاتا ہے کہ عبادتوں کا مقصد نفس کی پاکیزگی اور طہارت ہے۔ سورۂ شمس میں ارشاد ہوتا ہے:

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" "یقیناً وہ شخص کامیاب ہوگیا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا۔" (سورۂ شمس، آیت/۹)

انسان جب غور وفکر کرتا ہے تو اسے خود بخود یہ احساس ہوتا ہے کہ اس سے بالاتر اور کمال مطلق ہستی اس کائنات میں موجود ہے جس کی عظمت وجلالت کے سامنے انسان اور دوسری ساری مخلوقات ہیچ ہیں۔ کائنات کے ذرے ذرے کا وجود اسی سے وابستہ ہے اور یہی احساس انسان کو کمال مطلق پروردگار کی طرف کھینچتا ہے اور اس کی ساری توجہات کو اس کی طرف موڑ دیتا ہے۔ پھر کمال مطلق کی طرف شوق ورغبت کے یہی جذبات دلوں سے نکل کر دعاؤں اور اذکار کی شکل میں زبان پر آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عشق ومحبت اور شوق ورغبت سے سرشار کلمات دل کی گہرائیوں سے آنسوؤں کی برسات میں اس کی زبان پر جاری ہوجاتے ہیں اور انہیں کلمات کے سہارے وہ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کی مغفرت طلب کرتا ہے۔ جس دن انسان اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے اسی دن سے عبادت، راز ونیاز اور دعا ومناجات کا خوگر ہوجاتا ہے اور پھر یہ چیزیں اس کے وجود کا جز بن جاتی ہیں۔

یہ انسان کے باطنی جذبات کی مختلف شکلیں ہیں جو طرح طرح کی عبادتوں اور مناجاتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسلام کے علاوہ ہر دین وآئین میں عبادتوں کے مختلف انداز دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں خرافات اور بدعتوں کی آمیزش بھی ہوگئی ہے۔

عبادتوں سے قطع نظر اسلام نے معاملات اور نظام حیات کے دیگر شعبوں کو بھی وہ وسعت اور جامعیت عطا کردی ہے کہ دین کے بارے میں تحقیق کرنے والے اسے دیکھ کر حیرت زدہ ہیں۔ دراصل اسلامی شریعت جیسی جامع اور ہمہ گیر شریعت (جو انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں پر نظر رکھتی ہو اور زندگی کے جزئی اور فرعی مسائل میں بھی اپنے مستقل نظریہ کی مالک ہو۔) نہیں پائی جاتی۔ اللہ کا پسندیدہ دین صرف اسلام ہے اور بس۔

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" (سورۂ آل عمران، آیت/۱۹)

"وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ"

"اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن خسارہ والوں میں ہوگا۔ (سورۂ آل عمران، آیت/۸۵)

سوالات

۱۔ قرآن مجید میں علمی اشارے کیوں بیان ہوئے؟

۲۔ قرآن کے کسی ایک علمی معجزے کی وضاحت کیجئے؟

۳۔ قوانین الٰہی میں انسانی زندگی کے کن پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے؟

۴۔ قرآن کا تشریعی معجزہ کتنے پہلوؤں پر مشتمل ہے؟ مختصر وضاحت کیجئے۔

۵۔ اسلام کا مقصد عبادت کیا ہے؟

بائیسواں سبق

شبہۂ تحریف کا ازالہ

عالم اسلام کے جلیل القدر علماء اور محققین نے ہمیشہ تحریف قرآن کا انکار کیا ہے کیونکہ تحریف کا مسئلہ درحقیقت قرآن کے ظاہری انداز کے حجت ہونے سے مربوط ہے۔ (یعنی اگر قرآن میں کمی یا زیادتی مان لی جائے، تو پھر بالکل واضح آیتیں بھی کسی مسئلہ کے لئے حجت اور دلیل نہ رہ جائیں گی۔) لہٰذا ضرورت ہے کہ بالکل شروع سے ہی اس مسئلہ پر تحقیق کی جائے تاکہ حقیقت کا پتہ چل جائے۔

تحریف کے لغوی معنی

تحریف مادۂ "حـــرف" سے ہے جس کے معنی کنارہ اور گوشہ کے ہوتے ہیں۔ کسی کلام میں تحریف کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے اصلی معنی اور حقیقی مفہوم سے کنارہ کشی اختیار کرنا۔ اس لئے علماء نے تحریف کلام کی تعریف کچھ اس طرح فرمائی ہے:

جو کچھ کلام سے ظاہر ہو رہا ہو اس کے برخلاف تشریح کرنا اور نتیجہ نکالنا۔ اس تحریف کو "تحریف معنوی" کہتے ہیں کیونکہ اس تحریف میں کلام جس معنی پر دلالت کرتا ہے اسے چھوڑ کر اپنی من مانی تفسیر کی جاتی ہے۔

تحریف کے اصطلاحی معنی

اصطلاحاً تحریف کے سات معانی بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ **کلام کے معنی میں تحریف:** ایسی تفسیر و تاویل بیان کرنا جو لغت کے خلاف ہو، جس

میں لغوی معنی سے گریز کر کے بس اپنی پسند اور ذوق کے مطابق معنی بیان کئے گئے ہوں۔ اس طرح کی تاویل غیر معتبر ہے، اسے تفسیر بالرائے اور ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:

جو شخص اپنی رائے کے مطابق قرآن کی تفسیر کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

(غوالی اللئالی، ج/۴، ص/۱۰۴، حدیث نمبر/۱۵۴)

۲۔ **آیتوں یا سوروں کا ترتیب نزول کے خلاف قرار دینا:** قرآن کے سوروں میں الٹ پھیر تو ثابت ہے لیکن آیتوں میں اس کا احتمال بہت ہے۔

۳۔ **مشہور اور رائج قرأت کے برخلاف تلاوت کرنا:** آغاز اسلام سے لے کر صدیوں تک ایسا ہوتا رہا اور کچھ قراء مشہور قرأت کے برخلاف قرآن کی تلاوت کرتے رہے۔

۴۔ **قریشی لہجہ کے برخلاف تلاوت کرنا:** قرآن مجید اگرچہ قریشی لہجے میں نازل ہوا ہے، لیکن چونکہ عرب میں ہر قبیلے کا اپنا مخصوص لہجہ تھا، لہٰذا ہر قبیلے کے لوگ اپنے ہی لہجے میں قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے اور پیغمبر اسلامؐ نے بھی عرب کے مختلف لہجوں میں قرآن پڑھنے کی اجازت دے رکھی تھی اور مشہور حدیث "نزل القرآن علیٰ سبعۃ احرف" (قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے)

۵۔ **الفاظ میں ردوبدل:** یعنی قرآن کریم کے کسی لفظ کو ہٹا کر اس کی جگہ کسی دوسرے مترادف لفظ کو رکھ دینا۔ عبداللہ ابن مسعود اسے جائز سمجھتے تھے بشرطیکہ الفاظ کو بدلنے سے اصل معنی میں خلل اور تبدیلی پیدا نہ ہو۔ موصوف خود بھی تلاوت کے وقت سخت الفاظ کو آسان لفظوں سے بدل دیتے تھے۔

۶۔ **قرآن میں کچھ اضافہ کرنا:** ابن مسعود کے بارے میں ملتا ہے کہ آیت کو واضح کرنے کے لئے تلاوت کے وقت کچھ الفاظ تفسیر کے طور پر آیت کے بیچ میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ آیۂ بلغ

میں "اِنَّ عَلِیًّامَوْلَی الْمُؤْمِنِیْنَ" کا اضافہ کرکے پوری آیت اس طرح پڑھتے تھے: "یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ (اِنَّ عَلِیًّامَوْلَی الْمُؤْمِنِیْنَ) وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ"

(مائدہ ۶۷)

اور ابن عجرد کے پیروکار خوارج (عجاردہ) کا گمان تھا کہ قرآن میں سورۂ یوسف کا اضافہ کردیا گیا ہے۔

(الملل والنحل ج ۱ص ۱۲۸)

۷۔ قرآن سے کچھ کم کرنا: کچھ لوگوں کا گمان ہے کہ قرآن جتنا ہے، اس سے زیادہ تھا اور بھولے سے یا جان بوجھ کر اس میں کمی کی گئی ہے۔ تحریف کے مسئلہ میں شکوک وشبہات اور بحث ومباحثہ کا تعلق زیادہ تر تحریف قرآن کی انھیں آخری تین قسموں سے رہا ہے۔ جہاں تک قرآن میں کمی کی بات ہے تو سنی اور شیعہ دونوں کے یہاں اس قسم کی بعض روایتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس موضوع پر سارے مسلمانوں کا اجماع ہے کہ قرآن میں کسی چیز کا حتی ایک حرف کا بھی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ تو اب تحریف قرآن کے موضوع پر صرف ایک ہی رخ سے بحث کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن میں کچھ کمی ہوئی ہے کہ نہیں؟

نظریۂ تحریف کی بنیاد

اس غلط نظریہ کی بنیاد سنی اور شیعہ کتب حدیث کی کچھ روایتیں ہیں جو بظاہر تحریف قرآن پر دلالت کرتی ہیں لیکن ان روایتوں میں سے کوئی ایک روایت بھی قابل قبول نہیں ہے۔ کچھ تو سند اور سلسلۂ روایت کے اعتبار سے ضعیف اور غیر معتبر ہیں اور کچھ مفہوم اور دلالت کے اعتبار سے نادرست ہیں۔ اس وجہ سے علم اصول اور علم کلام میں ان روایتوں کو سرے سے ہی رد کردیا گیا ہے۔

علامہ شیخ محمد جواد بلاغی اپنی تفسیر "آلاء الرحمان" کے مقدمہ میں اس طرح کی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ کی بہت سی روایتوں کے درمیان مضمون اور محتویٰ (نفس مضمون) کے اعتبار سے شدید اختلاف ہے۔ ان میں تعرض اور تضاد پایا جاتا ہے اور اکثر روایتوں کی سند ان

افراد تک پہنچی ہے جنھیں علماء نے غلط بیانی، باطل مذہب کی پیروی اور روایات میں ہیرا پھیری کرنے والا قرار دیا ہے، اور ان میں سے کچھ تو جھوٹ بولنے اور اپنی طرف سے روایت گڑھنے میں اتنے مشہور ہیں کہ ایسے راویوں سے روایت نقل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ ان راویوں میں تو بہت سے دشمن اہلبیتؑ اور منکر امامت بھی ہیں۔ ایسے افراد کی روایتوں پر بھلا کیسے بھروسہ کیا جاسکتا۔

(تفسیر آلاء الرحمن ج ۱ص ۲۵)

راقم السطور بھی سنی شیعہ کتب میں موجود اس طرح کی ساری روایتوں کی چھان بین کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا کہ اس طرح کی خلاف شریعت روایتیں اکثر وبیشتر جعلی اور دشمنان دین کے کارخانوں میں تیار ہوئی ہیں اور کچھ روایتوں کی مناسب تاویل کی جاسکتی ہے۔ ان کا بھی تحریف قرآن سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ (دلائل سے آگاہی کے لئے "علوم قرآنی" ص/ ۳۶۰ تا ۳۷۹ کا مطالعہ کیجئے)

قرآن میں تحریف نہ ہونے کے دلائل

قرآن مجید میں تحریف نہ ہونے کے بہت سے مفصل دلائل بیان کئے گئے ہیں، جن کا خلاصہ آپ کے پیش نظر ہے۔

۱۔ تاریخی گواہی: پیغمبر اسلامؐ خود بھی محافظ قرآن تھے اور ہمیشہ اسے لکھنے اور حفظ کرنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے اور مسلمان بھی پابندی کے ساتھ اسے لکھتے اور یاد کرتے رہے۔ اسی لئے قرآن کے کئی کئی نسخے تیار کرکے اپنے گھر کے صندوقوں یا کیسوں میں رکھ کے محفوظ کرلیا کرتے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے غفلت نہیں برتتے تھے۔ اس کے علاوہ قرآن کے بہت سے نسخے اسی وقت پورے عالم اسلام میں بھیج دیئے گئے تھے۔ آغاز اسلام میں ہی حافظین قرآن کی ایک لمبی فہرست تیار ہوگئی تھی جنھیں اسلامی سماج میں کافی اہمیت دی جاتی تھی۔

عوام الناس کے علاوہ اسلامی دانشوروں اور بزرگ ہستیوں نے بھی اس سلسلہ میں بڑا اہم

کردار ادا کیا ہے۔ قرآن مجید مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں حرف آخر اور سنگ میل سمجھا جاتا ہے اور مختلف قسم کے اسلامی علوم کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی دانشوروں نے ہمیشہ قرآن کریم کی ضرورت محسوس کی ہے اور اس سے رابطہ برقرار رکھا ہے۔ اگر قرآن کریم میں کچھ کمی زیادتی ہوتی تو لوگ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

۲۔ قرآن کا متواتر ہونا: اس وقت مسلمانوں میں رائج قرآن مجید کا ہر دور میں متواتر ہونا (وہ بات جس کے نقل کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ آدمی کو اس کی حقانیت کا سو فیصد یقین ہو جائے۔) مسلم الثبوت ہے۔ قرآن کو کلام خدا ماننے کی شرط بھی یہی ہے کہ اس کا ہر حرف، ہر لفظ اور حتیٰ کہ ہر حرکت و سکون متواتر ہو، یعنی سارے مسلمانوں نے اسے دست بدست اور سینہ بسینہ ایک دوسرے کو منتقل کیا ہو۔ چونکہ تحریف قرآن سے متعلق روایتوں میں جن کلمات یا آیات کو قرآن کا حصہ بتایا گیا ہے وہ خبر واحد ہیں یعنی متواتر نہیں ہیں، لہٰذا انہیں بعنوان قرآن کوئی بھی مسلمان قبول نہیں کر سکتا۔ درحقیقت خبر واحد صرف فرعی اور جزئی مسائل میں قابل قبول ہے ورنہ عقائد اور علم اصول میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

۳۔ قرآن کا معجزہ ہونا: قرآن مجید کا معجزہ ہونا ہی اس میں ہر طرح کے رد و بدل کی تردید کے لئے کافی ہے۔ علماء نے اسے قرآن مجید میں تحریف نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل قرار دیا ہے کیونکہ اگر قرآن میں کوئی اضافہ کر دے تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ اس نے قرآن مجید جیسا کلام پیش کر دیا اور یہ ناممکن ہے:

"قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا"

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جنات سب مل کر قرآن کا مثل لے آنا چاہیں تب بھی نہیں لا سکتے چاہے سب ایک دوسرے کے مددگار اور پشت پناہ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔" (اسراء/۸۸)

اسی طرح اگر قرآن میں کچھ کمی ہو جائے تو بھی پہلے جیسا نظم و آہنگ باقی نہ رہ سکے گا جس کے نتیجے میں قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور معانی و مطالب کی اعجازی شان ختم ہو جائے گی۔

قرآن کریم کے الفاظ و کلمات میں تبدیلی بھی اعجاز قرآن سے ناسازگار ہے کیونکہ کسی بھی قسم کے رد و بدل کی صورت میں قرآن مجید وحی الٰہی اور معجزۂ پروردگار نہ رہ جائے گا اور ایسی صورت میں کلام خدا کے بجائے اسے کلام بشر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ تو قرآن میں کسی بھی طرح کی کمی زیادتی یا اس کے الفاظ میں تبدیلی اعجاز قرآن کے برخلاف ہے۔

۴۔ اللہ کی ضمانت: "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ"

"ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہمیں اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" (حجر/۹)

اس آیت میں اللہ نے ضمانت لی ہے کہ وہ قرآن کریم کو ہر طرح کی تحریف اور بربادی سے محفوظ رکھے گا۔ لطف پروردگار کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کو بالکل صحیح و سالم رکھے۔ چونکہ قرآن کریم ہمارے رسول کا زندہ معجزہ، اسلامی تعلیمات کا قطعی ثبوت اور ہدایت الٰہی کا خزانہ ہے، لہٰذا اسے حجت اور دلیل کے طور پر قیامت تک ہر طرح کی آفت سے دور رہنا چاہئے۔

۵۔ صحیح اور جعلی روایتوں کے پرکھنے کا معیار: پیغمبر اسلامؐ سے منقول وہ روایتیں بھی قرآن مجید میں تغیر و تبدل نہ ہونے کی واضح دلیل ہیں جن کا مضمون کچھ اس طرح ہے: "ہر حق تک پہنچنے کے لئے ایک حقیقت ہے جو اسے آشکار کرتی ہے اور ہر سچائی تک پہنچنے کے لئے ایک نور ہے جو اس سچائی کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ (اور وہ نور و حقیقت قرآن مجید ہے۔) پس جو روایت بھی مطابق قرآن ہو اسے قبول کر لو اور جو قرآن سے ٹکرا رہی ہو اس کا انکار کر دو۔" (اصول کافی ج/۲ص/۶۹)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن مجید میں تغیر و تبدل کا امکان ہوتا تو کیا یہ روایتوں کے صحیح اور جعلی ہونے کا معیار بن سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔

قرآن مجید کو ہمیشہ اور ہر زمانے میں ہر طرح کی تبدیلی اور کمی زیادتی سے محفوظ رہنا چاہئے

تا کہ یہ کتاب ہر دور میں معتبر اور حق و باطل کے پرکھنے کا معیار ہو۔

۶۔ اہلبیتؑ کے واضح بیانات: ائمہ معصومینؑ کے ارشادات و فرمودات بالکل واضح طور پر تحریف قرآن کی تردید کرتے ہیں۔ (علوم قرآنی ص/۴۵۴)

اور شیعہ اثنا عشری بھی اہلبیتؑ کی پیروی کرتے ہوئے ہمیشہ تحریف قرآن کو محال اور ناممکن سمجھتے رہے ہیں مثال کے لئے ایک روایت ملاحظہ ہو:

امام محمد باقرؑ نے سعد الخیر کے خط میں تحریر فرمایا ہے: ''قرآن کو پس پشت ڈال دینے کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ اس کے حروف و کلمات کو تو اپنی اصل حالت پر باقی رکھا مگر اس کے احکام و قوانین کو بدل ڈالا۔'' (اصول کافی ج/۲/ص/۶۲۷ ح/۱)

امامؑ نے یہ بات واضح کر دی کہ قرآن مجید کے معانی و مفاہیم میں من مانی تو ہوئی ہے لیکن الفاظ و آیات من و عن اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں۔

۷۔ شیعہ علماء کا نظریہ: شیعہ علماء ہمیشہ سے تحریف قرآن کے منکر اور مخالف رہے ہیں۔ البتہ کچھ شدید قسم کے اخباریوں نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ ہرگز شیعہ نظریہ کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔ (کیونکہ ان کا شمار نامور اور صف اول کے شیعہ علماء میں نہیں ہوتا۔)

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں تحریف قرآن کی تردید کے حوالہ سے بزرگترین علمائے تشیع میں سے ایک نامور شخصیت کا بیان پیش کر دیا جائے۔ (ہم نے تحریف کی مخالفت میں بزرگ علمائے تشیع کے بیانات اپنی کتاب "صیانة القرآن من التحریف" میں بالتفصیل بیان کر دیئے ہیں۔) پس جو شخص بھی ہماری طرف یہ نسبت دے کہ ہم قرآن کو اس سے زیادہ سمجھتے ہیں، وہ جھوٹا ہے۔

(اعتقادات شیخ صدوق مع شرح باب حادی عشر ص/۹۳۔۹۴)

شیخ المحدثین ابو جعفر محمد بن علی ابن الحسین ابن بابویہ شیخ صدوقؒ (متوفی ۳۸۱ھ) اپنے رسالہ ''اعتقادات'' میں رقمطراز ہیں: ''ہمارا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ پر جو قرآن نازل ہوا تھا وہ بعینہ یہی موجودہ قرآن ہے جو بغیر کسی کمی و زیادتی کے ۱۱۴ سوروں پر مشتمل ہے۔

ایک تہمت کی تردید

تحریف قرآن کے موضوع پر منصفانہ تحقیق کرنے والے بہت سے نامور علمائے اہل سنت شیعوں کو تحریف قرآن کی تہمت میں مبرّیٰ مانتے ہیں۔ سب سے پہلے جس سنی عالم نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں وہ شیخ اشاعرہ ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری (متوفی ۳۲۴ھ) ہیں۔ انھوں نے ہی مکتب اشعری کی بنیاد ڈالی اور عقائد کے اعتبار سے دور حاضر کے سنی اسی مکتب خیال کے پیرو ہیں۔

یہ 'مقالات الاسلامیین' میں لکھتے ہیں:

شیعہ اثنا عشریہ میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تنگ نظر، ظاہر بین، ناسمجھ اور دینی مسائل میں سادہ لوح افراد پر مشتمل ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں کچھ کمی ہو گئی ہے ان کی دلیل وہ روایات ہیں جو محققین کے نزدیک غیر معتبر ہیں۔ البتہ یہ لوگ بھی قرآن کریم میں زیادتی اور اضافہ کا پوری طرح انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہرگز زیادتی نہ ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ دوسرا گروہ محققین، صاحبان عقل و خرد اور نظریۂ اجتہاد کے طرفداروں کا ہے جو قرآن میں خواہ زیادتی، خواہ کمی ہر طرح کی تحریف کے منکر ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ جو قرآن مجید پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوا تھا وہ بغیر کسی کمی، زیادتی اور تغیر و تبدل کے آج تک اپنی اصلی حالت پر باقی ہے۔

(مقالات الاسلامیین ج/۱/ص/۱۱۹۔۱۲۰، صیانۃ القرآن من التحریف ص/۷۹تا۸۱)

اسی طرح اور بھی بہت سے نامور سنی علماء مثلاً استاد شیخ محمد مدنی اور محمد عبداللہ دراز وغیرہ نے اس سلسلے میں شیعوں کا دفاع کیا ہے اور شیعوں کی طرف تحریف قرآن کی نسبت کو ظلم و ستم سے تعبیر کیا ہے۔

(صیانۃ القرآن من التحریف ص/۷۹تا۸۱)

سوالات

۱۔تحریف قرآن کن معنوں میں قابل بحث ہے؟نیز کون سا معنی سب سے زیادہ زیر بحث رہا ہے؟

۲۔قرآن مجید میں تحریف نہ ہونے کے دلائل کا خلاصہ کیجئے۔

۳۔قرآن کریم کا متواتر ہونا تحریف کے شبہ کو کیسے دور کرتا ہے؟

۴۔ قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ...(اسراء/۸۸) یہ آیت تحریف قرآن کے منافی ہے۔کیسے؟

۵۔تحریف قرآن کے بارے میں شیخ صدوقؒ نے شیعوں کا کیا نظریہ بیان کیا ہے؟

۶۔تحریف قرآن کے بارے میں ابوالحسن اشعری نے شیعوں کا کیا نظریہ بیان کیا ہے؟

- اس کتاب میں علوم قرآن سے متعلق تمام موضوعات کو آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
- اس کتاب میں ہر سبق کے آخر میں دیئے گئے سوالات اس سبق کے سارے مطالب پر محیط ہیں۔ اگر طالب علم ان کے جوابات یاد کرلے تو گویا اس نے مختصر سہی مگر علوم قرآن کے ایک جامع دورہ (Phase) کا علم حاصل کرلیا ہے۔
- یہ کتاب حوزات علمیہ، جامعات اور قرآنی مدارس و مراکز میں تدریس کے لئے مرتب کی گئی ہے۔

TANZEEMUL MAKATIB
Golaganj, Lucknow-18 INDIA
Phone: 0522-6565982, 6565985
Email: makatib.makatib@gmail.com